ذوقِ خامہ

ذوقِ خامہ

شوکت واسطی

○

کتابستان پبلشنگ کمپنی لاہور

اَدب اَدب کے لیے ہے کہ زندگی کے لیے
مِری بیاض اُٹھا لو تو فیصلہ ہو جائے

اِنتساب

حفیظ آثر کے نام

پیش لفظ

غزل ہیئت کے ساتھ ساتھ ایک خاص مزاج کی حامل ہے۔ غزل کے باب میں قدیم و جدید کی بحث بعید از کار ہے کیونکہ ہیئت کا تجربہ اس میں ممکن نہیں اور مزاج کو اگر بدل دیا جائے تو اسے محض قالب کی رعایت سے غزل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ماننا ہوگا کہ شعریت کا نظر کے ساتھ ساتھ فکر سے بھی گہرا رابطہ ہے۔ شعر گوئی مطالعہ اور مشاہدہ ہی کے واسطے سے اپنا قابلِ ذکر مقام متعین کر سکتی ہے۔ زندگی کے تجربات سے ذہن و دل پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور اُن کا کس ڈھب سے بیان ہوا یہی معیارِ فن ہے۔

شاعری زندگی کو فن میں جھلکانے کا نام ہے اور غزل داخلی اور خارجی کیفیات کی مظہر ہے۔ حاصلِ فکر و نظر!

ممتاز منگلوری

۱۸ر آگست ۷۵ء

یا رب ہے دل مدام کسی اضطرار میں
کچھ نقص رہ گیا ہے ترے شاہکار میں

اب پڑ چکی ہے خوب تمنّا کی خُو مجھے
تم آ گئے ہو، میں ہوں مگر انتظار میں

تنہائیِ سفر کی اذیت ہے دل شکن
اب کوئی راہزن ہی مِلے رہگذار میں

تیرے ستم پہ تیری طرف دیکھ کر ہوں چُپ
کِتنی طویل بات ہے اِس اختصار میں

اب یہ کھُلا کہ وُہ بھی مری جستجو میں تھے
میں جِن کو ڈھونڈتا تھا سوادِ بہار میں

گلرنگِ مے بکھیر کے رُخ پر چلے ہیں وُہ
قوس قزح طلُوع ہوئی رہگذار میں

شوکتؔ بچھڑ گیا ہوں اسی قافلے سے میں
منزل غروب ہو گئی جس کے غبار میں

کیوں پھول بن کے نازِ بہاراں اُٹھائیے
مر جائیے کسی کا نہ احساں اُٹھائیے

دوزخ بنائیے کسی ذرّے کو توڑ کر
قطرہ نچوڑ کر کوئی طوفاں اُٹھائیے

کاغذ کے پھول ہوں سبدِ گلفروش میں
یہ گر نہیں تو شہر سے دُکّاں اُٹھائیے

ساقی لبوں کا لمس مِلا دے شراب میں
اِک دن تو لطفِ چشمۂ حیواں اُٹھائیے

ہم آئینہ ہیں، آپ ہیں توقیرِ آئینہ
ہنس کر نقابِ رُوئے درخشاں اُٹھائیے

بے باک ہیں سلاسلِ زُلف و درائے دل
کوئی صدا ہو، سر پہ بھی زنداں اُٹھائیے

شوکتؔ غزل تو یہ ہے کہ اپنے شعُور سے
اس مہ جبیں کا لحنِ غزلخواں اُٹھائیے

ذرا توجہ تو دے محبت کی سادگی کس قدر حسیں ہے
کہ تجھ سے میں اس وثوق سے زہر لے رہا ہوں کہ انگبیں ہے

میں جانتا ہوں کہ زندگی کے وقار کا بھی سوال ہے یہ
پہ کیا کروں سامنے ترا نقشِ پا ہے اور پھر جبیں جبیں ہے

گھنیری زُلفوں کا سایہ پھیلا کہ رُوح کو نیند آ رہی ہے
بڑا پُر آشوب ہے زمانہ سکوں کا عالم کہیں کہیں ہے

وُہ جام و مینا سے نور پھوٹا، وُہ میری منزل ہوئی فروزاں
مجھے رہِ زیست میں ضرورت تمہاری اے رہرو نہیں ہے

ہمارے دل میں ہے عشق کی شورشِ مسلسل کا حشر برپا
یہ مختصر سا سفینہ کتنے مہیب طوفان کا امیں ہے

عظیم ہے ایشیائی آدم ایشیا کا حلف اُٹھائے
جہاں ضمیرِ آدمی پہ نازل ہُوا یہی پاک سرزمیں ہے

نظر بچا کر قریب سے یوں گذر گئی ہے بہار شوکت
کہ جیسے میری حیات میں ایک مستقل سی خزاں مکیں ہے

اس لیے میں جرمِ مے نوشی پہ آمادہ نہ تھا
لمس ساقی کے لبوں کا شاملِ بادہ نہ تھا

جس پہ گُل بُوٹے نہ تھے، اسپر منقّش تھے خدنگ
زیست کی ارژنگ کا کوئی ورق سادہ نہ تھا

اب تمنا گاہ کیوں ویران ہے اس کے بغیر
میں کبھی سنجیدگی سے جس کا دلدادہ نہ تھا

میرے دل میں بھی تھے ابرو اور آنچل جابجا
کس عبادت گاہ میں محراب و سجادہ نہ تھا

زندگی بھی تو کسی پرویز کی شیریں نہ تھی
دل اگر فرہاد تھا اپنا، یہ شہزادہ نہ تھا

رہروؤں کے پائے ہمّت کی سند ہے ہر مقام
کون سی منزل سے آگے پھر رواں جادہ نہ تھا

جانشینِ درد بھی شوکت سکوں ہوتا کبھی
ہر خوشی کے بعد تو کب غم کا اعادہ نہ تھا

مٹی میں ہزار دل ملے ہیں
جب پھول کہیں کہیں کھلے ہیں
جس حال میں زندگی گذاری
اے دل یہ ترے ہی حوصلے ہیں
گویا تو انہیں عزیز بھی ہے
اے دل تجھے اُن سے یوں گلے ہیں
اے راہرو تو ذرا ٹھہرنا
رستے میں کچھ اور قافلے ہیں
منزل پہ مراد بر ہی آئی
آخر ہمیں ہمسفر ملے ہیں
کونین بھی ہو تو ہم کریں طے
لیکن یہ دلوں کے فاصلے ہیں
شوکتؔ یہ جہاں یہ جاں یہ جاناں
غم کے بھی دراز سلسلے ہیں

○

دل ہیں ہمیں ملے کہ سرِ رہگذر ملے
روشن کہیں تو تیرا چراغِ نظر ملے

ہم نے کیئے ہیں جمع محبّت کے وہ خیال
تیری حسین آنکھ میں جو مُنتشر ملے

ہر بات زندگی میں بڑی دیر سے ہوئی
منزل پہ آلیے تو ہمیں ہمسفر ملے

ہو جائے گی طلوع مرے دل میں پھر اُمید
تم اس خلوص سے مجھے کیا سوچ کر ملے

گر تیرگی ہمارے مقدّر کی چیز ہے
پھر کیوں تری نظر سے شعورِ سحر ملے

اے ہمصفیر اتنی ہے بس داستانِ درد
قیدِ قفس میں آکے ہمیں بال و پَر ملے

کچھ لوگ وُہ کہ سارے جہاں کو سمیٹ لیں
کچھ لوگ اپنی ذات میں بھی مُنتشر ملے

ہر ایک سے ہم اپنا پتہ پوچھتے پھریں
لیکن ہمیں کسی سے نہ اپنی خبر ملے

شاید اُسی مقام پر بھٹکے ہیں قافلے
اِن کو ز راہِ لطف جہاں راہبر ملے

سوچا تھا اُن کے دَم سے گزاریں گے زندگی
شوکتؔ ہمیں وُہ ہم سے بھی مجبور تر ملے

○

خیالوں میں کچھ اس شدّت سے تُو در آئی ہے جیسے
مرا سارا بدن ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے جیسے
سوادِ ذہن میں تیرے بدن کا نُور ہے گویا
حریمِ دِل میں تیری رُوح کی رعنائی ہے جیسے
کسی کا قُرب جذبات آفریں لغزش فزا کب ہے
جوانی میں گُنہ پرور شبِ تنہائی ہے جیسے
بیابانِ تمنا میں کوئی ہوکے سے بھرتا ہے
ہو شاید تو، مجھے میری صدا ہی آئی ہے جیسے
مسلّط ذہن پر رہتے ہیں کچھ خود ساز اندیشے
سمندر سے گھٹا اُٹھ کر اسی پر چھائی ہے جیسے
ذرا سی روشنی سے اور بھی واضح ہے تاریکی
خرد نے وہم کی زنجیر خود پہنائی ہے جیسے
بدن ہے شاہکار اس میں مگر دل کی قلمکاری
کسی فن کار نے کچھ دل لگی فرمائی ہے جیسے
جھلکتی ہے لگاؤ کی بڑی محسوس کیفیّت
یہ مجھ کو دیکھ کر تیری نظر شرمائی ہے جیسے
متاعِ شوق چشمِ یار کی خیرات ہے شوکتؔ
کہ ہر نظّارہ دریوزہ گرِ بینائی ہے جیسے

عقل مصروف نئے دہر کی تعمیر میں ہے
آدمی کارگہِ خنجر و شمشیر میں ہے

دار پر آیا نظر جو سرِ تسلیم تھا خم
خیر مقدم میں بڑھا پاؤں جو زنجیر میں ہے

کتنے اشکوں سے ہے شاداب پری چہرۂ گل
کتنے تاروں کا لہو صبح کی تنویر میں ہے

وُہ اشارہ جو خموشی سے جنم لیتا ہے
سوزِ نغمہ میں نہ ہنگامۂ تقریر میں ہے

دل کئی ڈوبے ہیں تو عشق نے پائی ہے نمو
رنگ سو اُبھرے ہیں تو حُسن یہ تصویر میں ہے

میرے ہی جذبۂ وحشت کی تسلّی کے لیے
یہ جنوں زار تری زُلف کی زنجیر میں ہے

کم نہیں مومن و غالب سے عقیدت شوکتؔ
دلِ سخن سنج مگر پیرویِ میرؔ میں ہے

رہینِ چارہ گر و غم گسار گذری ہے
ہماری عمر سرِ کوئے یار گذری ہے
رَوِش رَوِش پہ چمن کے بجھے بجھے منظر
یہ کہہ رہے ہیں یہاں سے بہار گذری ہے
اس اک نظر کی تمنا رہی حریفوں کو
جو پُر خلوص نظر تم پہ بار گذری ہے
یہ اور بات کہ ساری حیات بیت گئی
نہ آئے تم نہ شبِ انتظار گذری ہے
کٹی ہے شب کبھی ویراں غلام گردش میں
کبھی یہ حلقہ بگوشِ نگار گذری ہے
بھلا بُرا تھا بہر حال وقت بیت گیا
کہ زندگی تھی بہرِ اعتبار گذری ہے
جدید دَور میں شوکتؔ ہو تم غزل آرا
ہمیں یہ بات بڑی ناگوار گذری ہے

○

جہاں جہاں نو دمیدہ صبحو تمہاری روشن کرن گئی ہے
وہاں سمٹ کر جبینِ انساں سے تیرگی کی شکن گئی ہے
ذرا اِن آزادہ رَو بہاروں کے تند پندار کو جگا نا
خزاں بڑی احتیاط سے ہمصفیر سوئے چمن گئی ہے
غلط کرو غم نہ بے محابا، کہیں حوادث نہ دیکھ پائیں
نظر بچا کر اُٹھاؤ ساغر کہ زندگی جُرم بن گئی ہے
ہُوئی اگر مشتہر محبت نہ طنز فرما مِرے جنوں پر
تری جوانی کی داستاں بھی تو انجمن انجمن گئی ہے
سماج اَب سیم وزر کی دیوار اور اُونچی نہ کر سکے گا
نیا زمانہ، نیا زمانہ، گئی وُہ رسم کہن گئی ہے
اَدب میں شوکتؔ نئے نئے نظریوں کی تخلیق ہو رہی ہے
حیات کی سرحدوں تک آخر نگاہِ اربابِ فن گئی ہے

ہمدم نہ ڈر کہاں کا زمانہ کہاں کے لوگ
حائل نہ کب دلوں میں ہوئے درمیاں کے لوگ

ہے تیری آنکھ سے بھی زیادہ کہیں نشہ
پھر کیوں نیاز مند ہیں پیرِ مُغاں کے لوگ

رخسار و لب کا عالمِ گل آفریں نہ پوچھ
قائل نہیں رہے سحرِ گُلستاں کے لوگ

کچھ یوں اُجڑ گئی ہیں نگاہوں کی بستیاں
جیسے ترے ہی ساتھ تھے سارے جہاں کے لوگ

بیٹھا ہوں اک طرف کسی فن کار کی طرح
کردار بن گئے ہیں مری داستاں کے لوگ

ویران ہو گئی حرم و دَیر کی فضا
آ بیٹھے تیری بزم میں ہر آستاں کے لوگ

آخر خلوص کی بھی کوئی حد ضرور ہے
منزل پہ کب رہے ہیں بہم کارواں کے لوگ

شہرِ وفا تھا دل اِسے کیا حادثہ ہوا
شوکتؔ کہاں چلے گئے آخر یہاں کے لوگ

مجھے تو رنج قبائے تار تار کا ہے
خزاں سے بڑھ کے گلوں پر ستم بہار کا ہے

کوئی نگاہ تو قندیل صرف منزل کی
چراغ دل کوئی ہر ایک رہگذار کا ہے

ہر ایک ذرّے کو ہے آفتاب کی توفیق
ہر ایک قطرے میں اِمکان آبشار کا ہے

ہزار رنگ صبُوحی میں، سو فسُوں گل میں
مگر جو رُوپ لب و عارضِ نگار کا ہے

اگر نشہ ہے تو ساقی کی مست آنکھوں میں
اگر مزہ ہے تو محبُوب کے کنار کا ہے

ہمارے عشق کی سنجیدگی پہ طنز نہ کر
ہمیں خبر ہے مگر مسئلہ وقار کا ہے

کسی کے وصل کے لمحے بھی خُوب تھے شوکتؔ
مگر جو ہجر میں عالم یہ انتظار کا ہے

○

شراب پیتے رہے، ذکرِ یار کرتے رہے
بہار زاد، طوافِ بہار کرتے رہے

ہُوا نہ ہم سے، محبت کو جُرم جانتے ہم
کبھی تمہیں، کبھی ہم خود کو پیار کرتے رہے

کبھی ثواب بھی سرزد ہُوا تو بے منشا
کبھی گناہ بھی بے اختیار کرتے رہے

چلے تو آپ ہی اپنی صلیب اُٹھا کے چلے
جو کر سکے وُہ ترے جاں نثار کرتے رہے

بڑے وثوق سے دُنیا فریب دیتی رہی
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے رہے

تمام عُمر تری آرزو رہی ہم کو
تمام عُمر ترا انتظار کرتے رہے

کہاں گئے وُہ ندیمانِ خاص جو شوکتؔ
ہمیشہ عہدِ وفا اُستوار کرتے رہے

گر کہیں گیسوئے جاناں نہیں لہرائیں گے
سفرِ زیست کے راہی کہاں سستائیں گے

ہم اگر رند نہیں راندۂ ہستی ہوں گے
ساقیا در سے ترے اُٹھ کے، کہاں جائیں گے

ہم تری بزم سے یہ سوچ کے لوٹ آئے ہیں
تو زمانے کو ذرا دیکھ لے پھر آئیں گے

شہرِ آغوشِ بُتاں دشتِ وفا کے بدلے
جذبِ دل سوچ لے کیا کھوئیں گے کیا پائیں گے

مَے بہ اندازۂ پیمانہ ہے، غم بے انداز
مے کدے میں بھی طبیعت کو نہ بہلائیں گے

سر جو زانو پہ ہے، ہوگا وہی نیزے پہ بلند
جسم جو گود میں ہے، دار پہ لٹکائیں گے

جیتے جی لوگ نکالیں گے جنازوں کے جلوس
مر گئے ہم تو یہ اعزاز سے دفنائیں گے

سیکھ جائیں گے جو دامانِ خزاں میں رہنا
کھِل کے پھر پھول بہاروں میں نہ مُرجھائیں گے

کس ستمگر سے توقع پہ چلے ہیں شوکتؔ
اپنے کچکول میں خوں اپنا ہی بھر لائیں گے

ورائے جسم و جاں یا ماورائے جسم و جاں ہم ہیں
بتائیں کیا کسی سے مل کے اے شوکتؔ کہاں ہم ہیں

نشے کو مے کی صورت جام میں بھرنا نہیں ممکن
مگر اُس آنکھ کی ہر کیفیت کے ترجماں ہم ہیں

ہمیں سے اکتسابِ سوز بھی کرتے تھے پروانے
تمہاری بزم میں تو شمعِ کشتہ کا دھوآں ہم ہیں

اجل ہے یا ترا آغوش ہے یا نیند کی وادی
ہمیں آرام سا کچھ مل گیا ہے ، یہ کہاں ہم ہیں

کہیں بُو دیس کی مٹی کی جا سکتی ہے سانسوں سے
ہزار اس کو وطن تسلیم بھی کر لیں جہاں ہم ہیں

ہمارے دَم سے بامعنیٰ لبوں کا خندۂ بیجا
جو بے مقصد ہیں دل میں دفن راز، اُن کی زباں ہم ہیں

بہار آلود ہونٹوں سے رہی ہے رسم و رہ شوکتؔ
چمن ہائے معانی میں یونہی کب گلفشاں ہم ہیں

ہم عزیز اِس قدر اَب جی کا زیاں رکھتے ہیں
دوست بھی رکھتے ہیں تو دُشمنِ جاں رکھتے ہیں

ہاں وہی لوگ جو دلدادۂ فصلِ گل تھے
ہیں وُہ بیزار کے ارمانِ خزاں رکھتے ہیں

ذہن افسردہ ہُوا ایسا کہ اعصاب ہیں شل
ورنہ ہم نام خُدا قلب جواں رکھتے ہیں

سائے سے کرتے ہیں ہم اپنے کڑی دُھوپ میں اوٹ
آنکھ کو تیرگی میں نُور فشاں رکھتے ہیں

لبِ محبُوب ہو، پیمانۂ صافی ہو کہ زہر
جسم جل اُٹھتا ہے ہم ہونٹ جہاں رکھتے ہیں

ہم سفر کوئی جہاں چھوڑ کے چل دیتا ہے
اُسی منزل کا لقب سنگِ گراں رکھتے ہیں

جس جگہ دل تھا وہاں حسرتِ دل باقی ہے
جس جگہ زخم تھا اَب صرف نشاں رکھتے ہیں

لڑکھڑا جاتے ہیں میخانہ ہو جیسے دُنیا
لاکھ ہم پاؤں سنبھل کر بھی یہاں رکھتے ہیں

اُن کی دزدیدہ نگاہوں کو دُعا دو شوکتؔ
ورنہ معلوم جو ہم طبعِ رواں رکھتے ہیں

ہم کچھ آگاہ نہ تھے رسمِ جہاں سے پہلے
درد کے بعد دوا، ضبط فغاں سے پہلے

سائے کی طرح تھا آغوش بدن سے آگے
ناؤ ساحل پہ لگی، آبِ رواں سے پہلے

دم بخود دیکھ کے انبوہ سروں کا جلاد
اس پہ ہر ایک کا اصرار یہاں سے پہلے

آپ تو کرنے لگے آتے ہی تلوار کی بات
مہرباں کچھ تو کہا ہوتا زباں سے پہلے

دیو حالات کی محبوس پری یوں بھی نہ تھی
زندگی، واہمۂ سود و زیاں سے پہلے

میں بھی تو مرکزی کردار ہوں تیری مانند
یہ کہانی کروں آغاز کہاں سے پہلے

ہم نے خود دیکھی ہے گلرنگ حسینوں کی بہار
گلشنِ دل میں اس آشوب خزاں سے پہلے

شوکتؔ اب حسنِ طبیعت ہے خود اپنے دم سے
اخذ تھا انجمنِ ماہ وشاں سے پہلے

سو ذرّوں سے خوں سینچ کے اک شاخ ہری ہے
فطرت کے ہنرمند بڑی بے ہنری ہے

ہم بھی لیے بیٹھے ہیں لہو ساغرِ دل میں
ساقی ہی کے شیشے میں نہیں لال پری ہے

ہر دن کے گریبان میں ہے شام کا تارہ
داماں میں ہر شب کے چراغِ سحری ہے

اُس آنکھ کی تردید کرو جام و سبُو سے
اے اہلِ خرابات بڑی بے بصری ہے

یوں سوچ رہے ہو مرا دل توڑ کے گویا
دلداریٔ احباب فنِ شیشہ گری ہے

اے معترضو جُرم سہی بادہ گُساری
ماخوذِ غمِ زیست مگر اس سے بَری ہے

ہم لوگ بچھڑ جائیں گے منزل پہ پہنچ کر
گر دو ہمیں گمراہ یہی راہ بَری ہے

بیگانہ سہی ذات سے اربابِ جنوں مند
خود آگہیٔ اہلِ خرد، خود نگری ہے

اُس آنکھ کو دیکھے ہوئے بیتا ہے زمانہ
شوکتؔ وہی اب تک نشۂ بے خبری ہے

تری آنکھ سے ہے دل کو طلبِ سرورِ بادہ
کہیں عشق بن نہ جائے یہی آرزوئے سادہ

ترے ہونٹ کے کنارے لبِ جام سے زیادہ
کہاں عینِ رنگ بادہ، کہاں عکسِ رنگِ بادہ

تری طرح دوستی سے مجھے کب گریز ممکن
ترا شوق بالا رادہ، مرا عشق بے ارادہ

تری بے توجہی میں ہے ضرور کچھ توجّہ
مرا سوز ورنہ کیوں ہو، کبھی کم، کبھی زیادہ

نہ رہیں گے یاس پرور یہ خزاں کے تُند تیور
جو بہار آفریں ہو کسی پھُول کا ارادہ

ہے شعور کا مزاحم کبھی زھر کا پیالہ
ہے جنون کے مقابل کبھی دار ایستادہ

کوئی تو شکست مانے، کہ ازل سے رُوبرو ہیں
ترا دستِ فیض پرور، مرا دامنِ کُشادہ

جو ہو ساتھ اپنے شوکتؔ کوئی خُوبرو مسافر
بنے ہم نشاطِ منزل، یہ دراز و سخت جادہ

مے کا مشتاق ہے دل آنکھ کا سودائی ہے
جذبۂ شوق بہ اندازۂ رعنائی ہے
انجمن میں بھی کسی انجمن آرا کے بغیر
دل سے تا حدِّ نظر عالمِ تنہائی ہے
شہرِ گل، انجمنِ ماہ وشاں، کوئے مغاں
دل کہیں بھی ہو مگر تیرا تمنّائی ہے
جب بھی ہم ابتریٔ حال سے مایوس ہوئے
زیست ماضی کی حسیں یاد اُٹھا لائی ہے
رنگ پہ دم سے ہے پروانوں کے سارا ماحول
شمع کو واہمۂ انجمن آرائی ہے
شہر میں رہ کے یہ احساس ہوا ہے کہ خوشی
دُور دیہات میں بجتی ہوئی شہنائی ہے
ہائے وُہ حسن کہ چڑھتی ہوئی کرنوں کی اڑان
آہ یہ شوق کہ ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے
آنسوؤں سے کیا سیراب دلوں کو شوکتؔ
نہر نکلی ہے تو اس تھل میں بہار آئی ہے

دیں گے نہ یہ شراب، فراواں ہی کیوں نہ ہو
صدغم سے جاں بلب کوئی انساں ہی کیوں نہ ہو

ستائیں گے ہم اپنے بدن ہی کی چھاؤں میں
رستے میں زُلف سایہ بداماں ہی کیوں نہ ہو

ہو گا نہیں فرو کبھی فطرت کا اقتضا
انساں گناہ کر کے پشیماں ہی کیوں نہ ہو

رہبر کی اوٹ ہو تو مسافر کو فائدہ
منزل نما چراغ فروزاں ہی کیوں نہ ہو

ہم ہیں تو دشت میں بھی اسے کھینچ لائیں گے
طبعاً بہار رہنِ گلستاں ہی کیوں نہ ہو

آباد عکس ہی سے ہُوا شہرِ آئینہ
در آیئے، مرا دل ویراں ہی کیوں نہ ہو

بچتا ہے دستبردِ محبت سے دل کہیں
ہرچند کوئی اس سے گریزاں ہی کیوں نہ ہو

ہجرِ حبیب بھی تو تمنّا نواز ہے
تجھ سے نہ ہم ملیں گے یہ آساں ہی کیوں نہ ہو

احیائے عہدِ رفتہ کا اِمکاں نہیں رہا
گو تیرے لوٹ آنے کا اِمکاں ہی کیوں نہ ہو

شوکتؔ پری وشوں سے نہ رکھئے معاملہ
اس میں شعور و شعر کا نقصاں ہی کیوں نہ ہو

○

ساقی حیات و موت میں تکرار ہو گئی
رسمِ زمانہ جام سے تلوار ہو گئی

ہم کو تھا اعتماد نظر کے خلوص پر
اُف یہ ستم ظریف ہی دیوار ہو گئی

حالات سازگار تھے اک مہ جبیں کے ساتھ
تقدیر دل سے برسرِ پیکار ہو گئی

کیا ظُلم ہے کہ حسن سی عفت مآب چیز
تزئینِ بزم و رونق بازار ہو گئی

شوکت ہُوئی طلوع کسی آنکھ سے سحر
میری نظر میں روکشِ انوار ہو گئی

لوگ تقدیر کو کیا جانیۓ کیا جانتے ہیں
ہم تو اسکو صلۂ تاب وتواں مانتے ہیں

رُک گئے ہم کہ تری دلشکنی ہوتی تھی
یہ نہیں ہے سرِ منزل نہیں پہچانتے ہیں

معرفت ہم میں نہ تبلیغ کریں اہلِ سلوک
ہم تو ہر شے کو مضافاتِ خُدا مانتے ہیں

مے ہو یا زہر اُسی دیرِ مُغاں سے لیں گے
خاک ہر در کی وفاکیش نہیں چھانتے ہیں

وقت کی نبض پہ ہمراز ترا ہاتھ سہی
ہم مگر وقت کی رفتار کو پہچانتے ہیں

آئینہ ٹوٹ گیا ہاتھ سے گر کر شوکتؔ
ہم خطاوار مگر سنگ کو گردانتے ہیں

یہ تو نہیں حوالۂ زنداں ہیں آج ہم
لیکن کہاں تھے جیسے پریشاں ہیں آج ہم
اے عشقِ بے اماں کوئی تیشہ پھر آزما
اے دردِ لا دوا پئے درماں ہیں آج ہم
لائی ہے زندگی ترے گرد و نواح میں
کچھ آشنائے ذائقۂ جاں ہیں آج ہم
شاید پھر اُن کو جرأتِ لغزش نہ ہو سکے
ضبطِ گناہ کر کے پشیماں ہیں آج ہم
عارض کے پھُول، زُلف کی بدلی، نظر کا چاند
تُو تو نہ کہہ کہ بے سر و ساماں ہیں آج ہم
شوکتؔ یہ کس بہار شمائل کا ہے سلوک
مانندِ گُل جو چاک گریباں ہیں آج ہم

ہم کو شعورِ ذات سے بیگانہ کر گئے
پھر یہ حسین لوگ نہ جانے کدھر گئے

تم ساتھ لے کے آئے تھے ہر التزامِ زیست
تم جب گئے تو جیسے وُہ شام و سحر گئے

حُسنِ لطیف و عشقِ ثقہ کی تلاش میں
مایُوس بزمِ دہر سے اہلِ نظر گئے

غماز صبح تھی یہ دیئے کی لطیف ضو
کیوں یار لوگ شدّتِ ظلمت میں مر گئے

تیور نظر جو آئے سفینوں کے تند تر
طُوفاں اُٹھے، بلند ہُوئے اور اُتر گئے

جیسے ہُوئی تمام یہاں پر حدِ خلوص
منزل پہ ساتھ چھوڑ کے سب ہمسفر گئے

ہر آدمی نے دی ہے وُہ تکلیف ذہن کو
ہم آئینے میں اپنے سراپا سے ڈر گئے

شوکتؔ گیا ہے واقعی اُٹھ کر ابھی ندیم
محسوس ہو رہا ہے زمانے گذر گئے

تھی کل اُداس تری آنکھ، آج مے کم ہے
ہر ایک لحظہ نئے حادثے کا ماتم ہے
وُہ دن ضرور تھے جب تم پہ پیار آتا تھا
مسلسل اَب تو ہمیں اپنی ذات کا غم ہے
حریفِ لالہ بنے گا حلیفِ لب ہو کر
تمہارا شعلۂ عارض ابھی جو مدھم ہے
یہ کون بیٹھ گیا ہے نگاہ کی زد پر
تمامِ انجمنِ جذب وشوق برہم ہے
حریمِ دل میں فروکش ہے اجنبی کوئی
مُصر ہے خاص ادا سے مگر کہ محرم ہے
پھر آج لائے ہیں سقراط کے گمان میں لوگ
پیالہ مُنہ سے لگاؤ یہ مے نہیں سَم ہے
تمام آنکھ مچولی ہے وقت کی شوکت
بہار کچھ بھی نہیں ہے خزاؤں کا رَم ہے

رابطہ کوئی نہیں ھم کو اگر الہام سے
آتے رہتے ہیں یہ دل کی سمت کیا پیغام سے
ہوگئی ھم پر مکمل زندگی کی داستاں
ابتدا، کی تھی تمہارے خوبصورت نام سے
رنگ تو مے میں ہے لیکن زندگی کا رَس کہاں
لوگ کیوں تشبیہہ دیتے ہیں لبوں کو جام سے
اس طرف سے بھی گذرتا ہے کسی چہرے کا عکس
دل میں تاروں کی طرح کچھ روشنی ہے شام سے
کس جوانی کو کیا جاتا ہے یاں بے داغ فرض
کونسا دِل بچ سکا ہے عشق کے الزام سے
اِس قدر ہم کو ملے ہیں آدمیّت کے حریف
شوکت اَب ہوتی ہے وحشت آدمی کے نام سے

○

تم پلاؤ یہ کم غنیمت ہے
مَے نہیں ہے تو سَم غنیمت ہے
ہے خوشی کی بھی کیفیت معلوم
ہو میّسر تو غم غنیمت ہے
تم نہ آئے سحر تو آ ہی گئی
دمبدم دمبدم غنیمت ہے
اس میں سنگِ گراں بھی ملتے ہیں
راہ کا پیچ و خم غنیمت ہے
رات دن آسماں ہیں چکّر میں
مل جو بیٹھیں بہم غنیمت ہے
زندگانی کا اعتبار نہیں
جو گذر جائے دَم غنیمت ہے
کعبہ و دَیر سے نجات ملی
تیرا نقشِ قدم غنیمت ہے
شاعری دل لگی نہیں شوکتؔ
جو ہے زورِ قلم غنیمت ہے

○

سوال سا مجھ کو پیدا کر کے سنانا آخر جواب میرا
نظامِ عالم کی گردشوں کو پلٹ رہا ہے شباب میرا
بنا کے یوں ذات کو معمّہ یہ ناز تیرا بجا ہے لیکن
نظارہ فرما مجھے بھی اک دن، اُٹھا بدن کا نقاب میرا
نگاہ سُلجھا چکی ہے دونوں دلوں کے اُلجھے ہُوئے تقاضے
مگر نہ تیرا حجاب اُٹھا، نہ کم ہُوا اضطراب میرا
طلُوعِ تعبیر کی طرح ذہن میں ہے پیہم نشاطِ فردا
کہ تیری ذات صفات پرور سے آفرینش ہے خواب میرا
حیات کس عالمِ تذبذب میں کاشت کی ہے میانِ گیتی
کہ یاس ہی چُن سکے، نہ اُمید کر سکے انتخاب میرا
کبھی جو زہرہ و مُشتری کی فضاؤں میں بھی اُڑا پھرے گا
ہے آدم و مہ نوَرد سے فکرِ بیکراں انتساب میرا
ترے جہاں میں کئی اچھُوتے جہان تعمیر کر رہا ہوں
ترے تعیّن کی ان حدوں میں بھی عزم ہے کامیاب میرا
یہ وقت و معمول کیا ہیں شوکتؔ سماج کے یہ اصُول کیا ہیں
مرے تحمّل کے شاخسانے ہیں، اذن لے انقلاب میرا

بے ہمتی کا دوستو الزام آئے گا
رہبر ہُوا بھی ساتھ تو دو گام آئے گا

تو بے نیاز ہو کے ذرا زُلف تو بکھیر
پہنچیں گے خود اسیر جہاں دام آئے گا

ہو گا نہ ایک شخص کی خاطر اَب اہتمام
جلوہ بدوش طورِ سرِ عام آئے گا

ساقی کوئی اجارہ نہیں ہے سرور کے
ہم تک نہ کس اُصول سے یہ جام آئے گا

آئی خزاں بہار کا وعدہ لیے ہُوئے
آشوبِ چشم اَب تجھے آرام آئے گا

آؤ طلوع ہو گی سیہ رات کی سحر
آؤ وُہ مہر آج لبِ بام آئے گا

گائے گی رُوح آپ کسی کا حسیں خیال
عشق وفا شعار پہ الزام آئے گا

اِنسان پر نہیں ہے عقیدہ اگر انہیں
اربابِ دین کے نہ خُدا کام آئے گا

شوکتؔ ہے کب سے گوش بر آوازِ زندگی
اُس بے وفا کا کوئی تو پیغام آئے گا

یہ بیشتر کبھی، تو کبھی کم بدل گئے
دل کے معاملات تھے ہمدم بدل گئے

کچھ وضعدار دوست تھے، کچھ معتبر رفیق
جو ساتھ ساتھ وقت کے پیہم بدل گئے

بدلی تری نگاہ تو میرے عزیز دوست
محسوس ہو رہا ہے دو عالم بدل گئے

انسان کی سرشت میں تحریف ہو گئی
پیمانہ ہائے مُثبت و محکم بدل گئے

اَب ہم نے واقعات سے سمجھوتہ کر لیا
حالات میرا نظریۂ غم بدل گئے

اک سانحہ سہی یہ دلوں کی لطیف ضد
کچھ دوست غیر ہو گئے کچھ ہم بدل گئے

شوکت پڑا نہیں ابھی نظمِ چمن میں فرق
گلچین و باغبان تو باہم بدل گئے

کی گئی ہے وُہ عطا فطرت بے باک مجھے
صید یک جست نظر آتے ہیں افلاک مجھے

بجھ گئے دل کے شرر تیری تجلی پا کر
بخش دی عقل نے سونے کی جگہ خاک مجھے

آپ ہی نے تو یہ سَودائے جنوُں سونپا ہے
آپ مت کیجیئے منت کش ادراک مجھے

شکل کے پَردے میں سیرت کو چھُپانے والے
گھول کے زہر میں دینے لگے تریاک مجھے

آشیانے کو میسّر ہے قفس کی ہر شکل
اس جگہ بھی تو مہیّا ہُوئی خاشاک مجھے

دردِ فرقت میں تری یاد کی لذّت ہے شریک
عالمِ گُل ہے مرا سینۂ صد چاک مجھے

شوکتؔ آلائش دل صاف ہُوئی جاتی ہے
چاہ زمزم ہے مرا دیدۂ نمناک مجھے

کسی کی چشمِ سادہ یاد آئی
حریفِ جام و بادہ یاد آئی
گھنے سائے ہُوئے ہیں دفن جس میں
وُہ دیوارِ فتادہ یاد آئی
ہمارے دن کے آنگن میں بھی اوڑھے
سیہ شب کا لبادہ یاد آئی
کسی کو بے تمنا بھول بیٹھے
کسی کی بے ارادہ یاد آئی
جو منزل چھوڑ آئے ہیں کہیں ہم
وہی جادہ بہ جادہ یاد آئی
دیارِ دَیر و کعبہ میں پہنچ کر
تری محفل زیادہ یاد آئی
لباسِ تنگ میں محبُوس شوکت
وہی طبعِ کُشادہ یاد آئی

کہیں ضرور فسانہ ہے ضم حقیقت سے
اُمید یاس سے پیدا ہے نورُ ظلمت سے
وہ کم سواد کہ تھے معتقد صُراحی کے
نشہ شناس ہُوئے آنکھ کی کرامت سے
خُدا کرے کہ رہے محفلِ مغاں آباد
کچھ اہلِ ذوق یہاں مل گئے ہیں قسمت سے
یہ زندگی کہ خُدایا تری ودیعت تھی
جہاں میں ہم نے گذاری بڑی مصیبت سے
فنِ لطیف کے کتنے ہی شاہکار یہاں
بروئے کار نہ آئے غمِ معیشت سے

گر آدمی یہاں انسان بن کے رہ سکتا
تو یہ زمین تھی بہتر ہزار جنّت سے

گھٹائیں، زُلف یا زنجیر، اضطراب بخیر
ہر ایک کھیلتا آتا ہے میری وحشت سے

بدن بدن ہے کوئی رُوح کا غلاف نہیں
ہر ایک شخص ہے مجبُور اپنی فطرت سے

خزاں کے بعد کہیں وقت تھم گیا شاید
ادھر سے گذری نہیں ہے بہار مُدّت سے

مرے خلوص سے وُہ بدگماں ہُوا شوکتؔ
ملا تھا میں جسے بڑھ کر بڑی عقیدت سے

○

تمام عالَم صد ہجر ہے وصال نہیں
فریبِ حسنِ نظر کے سوا جمال نہیں

ہے تیری ذات سے وجدان آشنا لیکن
میری نظر کو میسّر ابھی کمال نہیں

خود اپنی ذات کی تردید کیوں گوارا ہو
نہیں یہ مانتے ہم آپ کی مثال نہیں

ہمارے دل میں تمنا ہے جاگزیں اپنی
اسے زمانہ ہوا آپ کا خیال نہیں

مرا سوال مرے رنگِ رُخ سے ظاہر ہے
گدا نواز مجھے حاجتِ سوال نہیں

شباب دل سے زیادہ ہے ذہن کی میراث
ہیں چند ایسے بھی لمحے جنہیں زوال نہیں

کیا ہے وقت کا ہر ریگ زار طے شوکتؔ
ہمارے دل پہ مگر گردِ ماہ و سال نہیں

○

غالب میر اقبال بنے ہیں ہم کرتے ہیں سب کی بات
خود کہنے سے کیا ہوتا ہے دُنیا مانے تب کی بات

جس کو دیکھو پیٹ سے باہر پاؤں نکالے ٹھیگر ہے
لڑکے بالے بھُول گئے سب شرم کی ریت' ادب کی بات

چتوَن بھالا، نین بجریا، لٹ سپنولی، ہونٹ سیندور
اس بالم کی بات نہ پوچھو، ہر اک رُوپ غضب کی بات

ہائے وُہ رُت جب ہر چھایا میں آنکھ کرن بھر دیتی تھی
پھیکی اَب لگتی ہے نشیلے نین، رسیلے لب کی بات

نرناری چوکس ہی بھلے، دکھیا کی بپتا سُن لیں گے
سُدھ کھو کر یہ اَور زیادہ کرتے ہیں مطلب کی بات

پہلے پھول تھے ہم، پھر پھولوں پر بھنورا، اَب کانٹا ہیں
کڑوے بول بُرے مت مانو، اَب مت بھالو جب کی بات
پاکستان کے دیس میں سوہنی ہیر کی باتیں کرتے ہیں
کیوں شیرینِ عجم کا قصہ، کیوں لیلائے عرب کی بات
جانے کس کی ڈفلی پر یہ راگ پرائے گاتے ہیں
حسرت ہے ان یاروں سے ہم سنتے اپنے ڈھب کی بات
مِردے جی برہا کی رام کہانی اَب بسراؤ بھی
بھور کی راس رچاؤ شب کے ساتھ گئی وُہ شب کی بات
پی کے مدھر آنکھوں سے جواں راتوں کے قصیدے لکھتے تھے
لوگ بھی ہم کو یاد دلانے آئے ہیں شوکتؔ کب کی بات

○

دیکھئے دل کو تو اک عالمِ افکار ہے یہ
عشق سے ہو کے رہا اور گرفتار ہے یہ

زندگی کیا ہے تمناؤں کا آشوب کدہ
کون سے آئینۂ فکر کا زنگار ہے یہ

دیکھئے غور سے تو فہم طلب ہر پہلو
زیست ہے یا فنِ تجرید کا شہکار ہے یہ

وہم اور وسوسے اس عقل کے پروردہ ہیں
بڑھ کے وحشت سے میری جان کا آزار ہے یہ

اک مسافر ہے گلستاں میں خزاں دشت سے دور
کس قدر اہلِ گلستاں پہ مگر بار ہے یہ

گردِ رہ کہتی ہے گذرے ہیں ادھر سے کچھ لوگ
راہیو، عزم کی ضامن ہے کہ دیوار ہے یہ

دل کو ہے عصمتِ یوسف کے گواہوں کی تلاش
ہے کوئی ایسی زلیخا تو خریدار ہے یہ

کہدو فارغ سے ہمیں کب ہے سخن کا دعویٰ
شوکت اپنے لیے پیرایۂ اظہار ہے یہ

○

جنوں سکون، خرد اضطراب چاہتی ہے
طبیعت آج نیا اِنقلاب چاہتی ہے

نہ آج تیری نظر سے برس رہا ہے نشہ
نہ میری تشنہ لبی ہی شراب چاہتی ہے

نہیں سرورِ مسلسل نباہ پر موقوف
مدام آنکھ کہاں لطفِ خواب چاہتی ہے

سُنا رہا ہوں فسانہ تری محبت کا
یہ کائنات عمل کا حساب چاہتی ہے

وُہ عزم ہائے سفر لازوال ہوتے ہیں
حیات موت کو جب ہم رکاب چاہتی ہے

جُھلس رہا ہے بدن دُھوپ میں جوانی کی
یہ آگ زُلف کا گہرا سحاب چاہتی ہے

حریفِ حسن و محبت ہو دیر تک شوکتؔ
نگارِ عمر وُہ عہدِ شباب چاہتی ہے

دل دل کا شناسا ہے، آنکھ آنکھ کی محرم ہے
میں عشقِ مکمل ہوں، تو حُسنِ مجسّم ہے

کیا جانئے کب تک ہے یہ سانس کا تانتا بھی
آنا ہے تو آجاؤ، آنکھوں میں ابھی دم ہے

کیوں عزمِ تجسس کم، کیوں ذوقِ جنوں مدھم
رستے وہی پیچیدہ، زُلفوں میں وہی خم ہے

گر ڈُوب گیا سُورج ہم شمع جلالیں گے
ظُلمت کے تلاطم کا، جگنو کو نہیں غم ہے

ہم رین بسیرے کو منزل نہیں کہہ سکتے
گو بانگِ درا چُپ ہے، گو سوزِ حدی کم ہے

اِک نُور اُبھرتا ہے شاید یہ تمہیں ہو گے
ضَو مہر کی پھیکی ہے، لَو چاند کی مدھم ہے

شوکتؔ جو ہمیں رونے آئے ہیں اُنہیں پوچھو
کیا حادثہ گذرا ہے، کس بات کا ماتم ہے

تھا کون اس جہاں میں جو آسُودہ حال تھا
لب پر اگر نہیں تو نظر میں سوال تھا

محسُوس ہو رہا تھا زمانہ خلوص کیش
معلوم اَب ہُوا یہ ہمارا خیال تھا

تھے اہلِ ذوق اِس لیے گرویدۂ بہار
اِس میں نظر نواز تمہارا جمال تھا

جس کیف میں حیات بسر ہو گئی تمام
وُہ آپ تھے کہ آپ کا رنگیں خیال تھا

شوکتؔ شراب خانوں میں مستی نہیں رہی
اس چشمِ مے فشاں کا یہ ادنیٰ کمال تھا

ستانہ دل میں، زُلف کے نیچے ٹھہر نہیں
سایہ ہو یا سرائے، مُسافر کے گھر نہیں
اَب کے کسی کی زُلف محیطِ حواس ہے
اَب کے وُہ رات آئی ہے جس کی سحر نہیں
آسُودہ گام لوگ رواں ہیں وثوق سے
رہزن کا احتمال نہیں، راہبر نہیں
میرا شباب بھی تو پرستش کی چیز ہے
یہ حادثہ ہے اُن میں شعُورِ نظر نہیں
تھے آگہی میں اہلِ خرد ہم بھی مُستند
یہ اَور بات ہے کہ اَب اپنی خبر نہیں
یہ سلسلہ ہے مجھ سے تیری ذات تک دراز
اس دردِ زندگی کی حدیں مختصر نہیں
ہر آدمی کے سائے سے دُنیا میں بچ کے چل
شوکتؔ کسی بلا کا یہاں اَور ڈر نہیں

○

دشمن آپ کی بن کر جب مثال آتے ہیں
کیسا رنج ہوتا ہے، کیا ملال آتے ہیں
چاند پھر نکل آیا، بھونکنے لگے کتّے
کاروانِ شب کے منہ پھر شغال آتے ہیں
بے دریغ اگر ہم بھی اک جواب دے بیٹھے
بے جھجک ترے لب پر گر سوال آتے ہیں
روز و شب کی نوعیّت انقلاب زا ہو گی
ہم پہ تو اسی صُورت ماہ و سال آتے ہیں
کر رہے ہیں دل چھلنی اس وثوق سے جیسے
دوستوں کو زخموں کے اندمال آتے ہیں
منہمک گذرتے ہیں زیست کی کشاکش میں
چند ایسے لمحے بھی لازوال آتے ہیں
ذہن کی خلش کے بھی خُوب رہتے ہیں درپے
لوگ پَیر سے کانٹا جب نکال آتے ہیں
واقعہ گذر جائے یادداشت بھی لے کر
اک معاملہ ہو گا، سو خیال آتے ہیں
اس حریفِ مَے لب کے مستقل عقیدت مند
میکدے کو بھی شوکتؔ دیکھ بھال آتے ہیں

HAMDARD ... Delhi

مے سے ساقی علاج تشنہ لبی
کر نہ اپنے لبوں کی بے ادبی
وصل کی معرفت کا منکر ہو
کیا بدن کی ہر ایک حس ہے غبی
سینکڑوں درد ہو گئے مدھم
تیری خواہش کسی طرح نہ دبی
نیند بھی بندگی ہے، آ، سوئیں
اے وظیفہ گذار نیم شبی
پھر بھی سرمست ذات ہوں شوکتؔ
قطب و ابدال ہوں نہ پیرو نبی

○

ہر گلی میں دیکھتے تھے خُوب اَور نا خُوب ہم
اِس لیے اہلِ چمن میں ہو گئے معتُوب ہم

ایک ناہموار وادی کے مسافر کی طرح
نامساعد وقت سے دائم رہے منسُوب ہم

تیرتے ہیں یوں عناں ہر موج کی ہاتھوں میں ہے
یہ نہ ہو تو پھر سرابوں ہی میں جائیں ڈوب ہم

پھُول ہیں، چھُو بھی نہیں سکتی ہمیں کانٹے کی نوک
خشمگیں صرصر میں لہراتے ہیں بن کر دوب ہم

جسم و جاں پر جم رہی ہے وقت کے قدموں کی دھُول
ہو گئے ہیں اپنی نظروں میں بڑے محبُوب ہم

ہو گئی مُدّت کہ ہم سے ہوش کو اغماز ہے
ہاں کبھی اہلِ خرد سے تھے بڑے مرعُوب ہم

ڈھل گئے فن میں سند بن کر قبُولِ عام کی
جن خیالوں کو سمجھتے تھے بڑا معیُوب ہم

درد بھی مہمل ہے گر تسکین ناہنجار ہے
زندگی شوکتؔ گذاریں گے بہر اسلُوب ہم

وحشت کے واسطے نئی تدبیر چاہیئے
ان مہ وشوں کے پاؤں میں زنجیر چاہیئے

اے آنکھ مُسکرا کہ جوانی جنون ہے
اے زُلف پھیل جا اسے زنجیر چاہیئے

سو بار خواب میں تو ہُوئے آپ مہرباں
بارے یہ لُطف صُورتِ تعبیر چاہیئے

خود آدمی کے ماتھے پہ ہو سَر نوِشتِ زیست
خود آدمی کے ہاتھ میں تقدیر چاہیئے

اے اِنقلابِ شام و سحر کے نقیب، بس
اِنسانیت کو وقفۂ تعمیر چاہیئے

شیریں و شہزاد نہ لیلیٰ کی آرزو
اپنے ہی دیس کی ہمیں اِک ہیر چاہیئے

شوکت جمالِ دوست کا محرم خیال ہے
آئیں جنہیں بہار کی تصویر چاہیئے

جل نہ بجھے لوگ جوانی میں محبت کے لیے
دل کے دوزخ میں رہے جسم کی جنّت کے لیے

زیست اک وہم ہے بے عارض و زلفِ محبوب
پرتوِ رنگ ضروری ہے حقیقت کے لیے

کون پھینکے گا لپکتے ہوئے سائے پہ کمند
کون آمادہ ہے تا عمر رفاقت کے لیے

نجد پیمانہ ہے صرف ایک جنوں کا، ورنہ
یہ زمیں تنگ ہے انسان کی وحشت کے لیے

وقت کے بعد جو دیکھا تو اہم تھے نہ مفید
کام جو ہم نے اُٹھا رکھے تھے فرصت کے لیے

کھا گئی بھوک فن و فکر کے کتنے شہکار
بک گئے کیسے دل و ذہن معیشت کے لیے

ہائے وُہ میرزا محمُود کا ماتم بھی کریں
رونے پائے تھے نہ جی بھر کے جو عشرت کے لیے

صدق و اخلاص فقط ہم پہ ہے واجب شوکتؔ
کیا ہمیں رہ گئے دُنیا میں نصیحت کے لیے

تا عمر اِشتیاقِ نظارا رہا ہمیں
دیکھا تو کیوں نہ دید کا یارا رہا ہمیں

اے حسن آنکھ اُٹھا کہ ہے دل کو مغالطہ
تا عمر ایک وہم گوارا رہا ہمیں

ساحل نہ بیٹھ جائے کہیں زعمِ ناخُدا
اَب تک تو سازگار یہ دھارا رہا ہمیں

ہم نے غمِ حیات کو برداشت کر لیا
اِس کے سوا نہ جب کوئی چارا رہا ہمیں

شوکتؔ جو عزم کر کے چلے ہم تو رہنما
منزل تک ایک ایک ستارا رہا ہمیں

○

ہائے اُن کو خبر نہیں کرتے
کچھ مرے چارہ گر نہیں کرتے

جن کا معیارِ عزم ہو منزل
ہم انہیں ہمسفر نہیں کرتے

ذکر میرا، میری کہانی میں
دوست کیا سوچ کر نہیں کرتے

آپ کی زُلف کی حکایت ہے
ہم اِسے مختصر نہیں کرتے

دل تری بے رُخی سے ٹوٹ گیا
ہم شکایت مگر نہیں کرتے

یوں گذرتی ہے زندگی شوکتؔ
جیسے ہم خود بسر نہیں کرتے

وُہ نظر کوند کے صاحبِ نظراں گذری ہے
اک قیامت کہیں گذری ہے کہاں گذری ہے

اُس کے دامن میں ہے تریاک سمومِ ہستی
میکدہ سے جو گھٹا رقص کناں گذری ہے

کس کو راس آیا ہے منت کشِ احساں ہونا
کون ہے جس پہ نہیں زیست گراں گذری ہے

سانحہ ہے تو بہاروں کا چمن میں آنا
کبھی صحراؤں کے سَر سے بھی خزاں گذری ہے

زندگی آپ کا احساں تھا گذاری بے شک
زندگی آپ جو کہتے ہیں تو ہاں گذری ہے

شوکتؔ ایسا بھی ہوُا زیست بہ فیضِ وجداں
مے و معشوق سے رنگین و جواں گذری ہے

○

جام میں بھی نشہ طرازی ہے
کیف آنکھوں کا امتیازی ہے

اِک زمانہ ہُوا کہ دُنیا سے
ہم فقیروں کو بے نیازی ہے

اہتمامِ صلیب و دار ہُوا
آؤ گر ذوقِ سرفرازی ہے

حسن اگر جسم ہی پہ ہے موقوف
عشق برحق ہے گر مجازی ہے

دُشمنی میں ذرا خلوص تو ہے
دوستی تو زمانہ سازی ہے

جس قدر کوئی دل ہے آلُودہ
اس قدر زعم پاکبازی ہے

آدمیّت کے واسطے شوکت
اوّلیں شرط دلنوازی ہے

○

مرا ہی دل ہے بساطِ حسرت وگرنہ دُنیا میں کیا نہیں ہے
بس ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میرا خُدا نہیں ہے

کرامتِ ذوق وسحرِ وجداں شگفتنِ انجم و گل و مے
ہے معجزہ وسعتِ نظر کا، کوئی ادا خوشنما نہیں ہے

خزاں دمِ واپسیں نہیں ہے بہار کا اے گل تمنّا
حیات اِک جذبِ جاوداں ہے جہان ماتم سرا نہیں ہے

حصُول مقصد گراں نہیں ہے خلوصِ نیّت اگر ہو شامل
دُعا نہیں باریاب تیری کہ تو شریکِ دُعا نہیں ہے

مرا عقیدہ بھی کیفیت پر ہے زائران شراب خانہ
رہے نہ ایمان دوست کی آنکھ پر مگر یہ روا نہیں ہے

اسی جہاں میں زباں زدِ عام ہیں محبت کے سو فسانے
یہیں مرے دوست بھی ہیں شوکتؔ جنہیں خیالِ وفا نہیں ہے

سہل کی تیرے تصوّر سے جدائی ہم نے
عین دوزخ میں بھی فردوس بنائی ہم نے
نگہ و انجم و مہتاب کی رعنائی میں
شام سے صبح کی تمہید اُٹھائی ہم نے
قدر اَب آئی ہے جب بیت چُکی ہے ساری
زندگی ہائے جو بے کار گنوائی ہم نے
تیرے دربار سے مایوس پلٹ آئے ہیں
اپنی دہلیز پہ اَب دی ہے دہائی ہم نے
زندگی خام خیالی میں گذاری یعنی
کی بھلائی کی توقع پہ بھلائی ہم نے
خود ہر اک خواہشِ معصوم سے برتا اغماز
زندگی کر کے گذاری ہے پرائی ہم نے
وقت کے ساز کی پابند ہے شوکتؔ ہر لے
چھوڑ دی عرصہ ہوا شعلہ نوائی ہم نے

جس کی رہی تلاش ہمیشہ وہ تو نہ ہو
ممکن ہے تو ملے تو کوئی جستجو نہ ہو

تو ہی بتا یہ عشق کا ہے کون سا مقام
دل کو یہ آرزو ہے تری آرزو نہ ہو

حسنِ تہی وفا کبھی اس پھول کو بھی دیکھ
جس میں جمالِ رنگ تو ہو اور بو نہ ہو

یوں ہے کسی کی کیفیتِ چشم کی ہوس
جیسے کہیں شراب نہیں یا سبو نہ ہو

اے دوست میرے عشق پہ تنقید بھی ضرور
لیکن یہ سوچ لے یہ تری آبرو نہ ہو

ہاتھوں میں جو کھلا ہے وہ رنگِ حنا سہی
خنجر کو دیکھ اس پہ کسی کا لہو نہ ہو

اے زلف پھیل جا کہ نمائش نہیں ہے یہ
ہستی کا کیا ثبوت جو ذوقِ نمو نہ ہو

شوکتؔ ہم اُس کے دردِ تمنا کو بھول جائیں
پر وہ ستم ظریف بھی تو روبرو نہ ہو

جو حادثے تھے مقدر تمام گذرے ہیں
بغیرِ دوست کئی صبح و شام گذرے ہیں
کچھ اہلِ شوق بڑھے مد و جزر وقت کے ساتھ
کچھ اہلِ ذوق ترے ہم خرام گذرے ہیں
نقوش کون سے باطل نہیں بنے دل پر
خیال ذہن میں کیا کیا نہ خام گذرے ہیں
تری نگاہ سی مستی نہ پھر نصیب ہوئی
ہزار سامنے مینا و جام گذرے ہیں
کہاں گئے وُہ مسافر جو شوکت اک عمر
ہمارے دل کی طرف سے مدام گذرے ہیں

○

کچھ آبلہ پا گذر رہے ہیں
کانٹوں کے بدن نکھر رہے ہیں
دُنیا کی ہزار یورشوں میں
ہم آپ کو یاد کر رہے ہیں
منزل پہ نہ چھوڑ جایئے گا
ہم آپ کے ہمسفر رہے ہیں
دل درد سے ہو چلا ہے مانوس
زخم آپ ہی آپ بھر رہے ہیں
جینے کا عبث ہے ان پہ الزام
وُہ لوگ جو روز مر رہے ہیں
راہوں میں غبار اُڑ رہا ہے
کچھ قافلے پھر گذر رہے ہیں
کچھ ایسے بھی اہلِ دل ہیں شوکتؔ
سائے سے جو اپنے ڈر رہے ہیں

○

زندگی جب کبھی ہُوئی محسوس
اور آیا ہے آپ پر افسوس
غنچۂ دل نہیں کھلا اپنا
جا رہی ہے بہار بھی مایوس
بے نیازِ غمِ زمانہ ہوں
جب سے ہوں تیرے درد سے مانوس
عشق ایک ایک جی کی رُسوائی
دو دلوں کا یہ مُشترک ناموس
زندگی سر برہنہ پھرتی ہے
حجلۂ کائنات کی یہ عروس
اب نہ ہوگا یہ سر خمِ تسلیم
اب رہے تم کو حسرتِ پابوس
دل سے شوکت حرم میں آئے ہیں
دیکھنا یہ ترقیٔ معکوس

اُجڑے ہُوئے دل میں بھی ترا دھیان رہا ہے
شہروں سے بھی آباد بیابان رہا ہے

ہم نے تجھے سو رنج میں چھوڑا تھا مگر دوست
دل ترکِ تعلق پہ پشیمان رہا ہے

شاید یہ کسی تازہ مصیبت کے ہے در پَے
کچھ روز سے دل میرا کہا مان رہا ہے

کیا کیا تھی کسی شخص سے ملنے کی تمنا
مل کر بھی بدستور یہ ارمان رہا ہے

ڈھونڈا جسے اِک عمر کہیں وُہ تو نہیں تم
ٹھہرو تو سہی دل تمہیں پہچان رہا ہے

یہ مرحلۂ زیست بہر گام کٹھن تھا
تم ساتھ رہے ہو تو یہ آسان رہا ہے

تم آج ہمارے نہیں بنتے ہو تو کیا ہے
لیکن کبھی اس بات کا امکان رہا ہے

شوکتؔ کوئی صحرا تھا مرا قلب کہ اِک بار
ویران ہوا ہے تو یہ ویران رہا ہے

○

لائق حمد و ثنا ہو جانا
دیکھ اک بُت کا خُدا ہو جانا
جھلملاتا ہے کسی گھر کا چراغ
اس طرف سے بھی صبا ہو جانا
ترا ہنس دینا مری حالت پر
مرے ہر دُکھ کی دوا ہو جانا
ملنا اک عمر کی اُمّید کے بعد
ہائے پھر مل کے جُدا ہو جانا
مری ہر بات کا وحشت بننا
تری ہر بات ادا ہو جانا۔
آخر اِنسان فرشتہ بھی نہیں
جُرم کیوں ہے یہ خطا ہو جانا
شوکتؔ اس دِل کی یہ حالت کیا ہے
اس کو منظور ہے کیا ہو جانا

○

اس شہر کی ہواؤں کو خوشبو کی پیاس ہے
شوکتؔ ترے بغیر پشاور، اداس ہے

شاید بہار پر کوئی گذری ہے واردات
کانٹوں میں آن ہے نہ شگوفوں میں باس ہے

سونی پڑی ہوئی ہے اگر محفلِ خیال
کیا اس سے فائدہ جو کوئی آس پاس ہے

ہم ساغر و سبو سے بھی کرتے سرور اخذ
لیکن کسی کی آنکھ محیطِ حواس ہے

حالات کا تو ایک تھپیڑا نہ سہہ سکا
تھا ہم کو دل پہ ناز کہ طوفاں شناس ہے

ہم نے خدا کو سونپ رکھے ہیں تمام کام
ہر واقعہ پہ قلب سراپا سپاس ہے

کوئی جمیل جسم، کسی کا حسیں خیال
شوکتؔ ہماری طبع کو ہر کیف راس ہے

○

جمالِ ہم نفس اندازِ خوش گوار میں ہے
خوشا وہ دل کہ ہمیشہ خیالِ یار میں ہے
عجب خمار ہے اس چشمِ نیم بستہ میں
بڑا لطیف سکوں زُلفِ سایہ دار میں ہے
ھزار عالمِ ہستی عبُور کر کے بھی
ہنوز قافلۂ وقت رہگذار میں ہے
ہے اَور کون جو اِنساں کے بعد آئے گا
حیات کیسے مسافر کے اِنتظار میں ہے
تمام فتنۂ محشر ہے خاک میں اپنی
تمام جلوۂ ایمن مرے شرار میں ہے
اگر ہے ذوقِ عمل وسعتِ نگاہ کیساتھ
ہر ایک شخص کی تقدیر اختیار میں ہے
دماغ و دل کے تقاضے، ضمیر کی قدغن
ازل سے آدمی میدانِ کارزار میں ہے
گریز کر کے بھی بو پھُول میں رہی شوکتؔ
کسی کو فائدہ ماحول سے فرار میں ہے؟

ثمرِ گل کہیں برسا آیا
ابرِیاں خار اُگاتا آیا

ہوگیا وقت رواں تھم کر
پھر ذرا نیند کا جھونکا آیا

کھنچ گئی حدِ نظر تک دیوار
کیا خبر کوئی گیا یا آیا

ذہن کے بعد ہے دل بے قابو
شہر سے نکلے تو صحرا آیا

اجنبی ہوگئی ساری دُنیا
یاد جب بھی کوئی اپنا آیا

آئینے رُوپ میں ڈھل جاتے ہیں
ہم کہاں جب کوئی تم سا آیا

چمک اُٹھی ہیں خزاں کی آنکھیں
شاخ کی گود میں غنچا آیا

نہ توقع نہ تمنّا شوکتؔ
اَب تو یہ وقت کچھ ایسا آیا

کس گھڑی تازہ اِنقلاب نہ تھا
واقعہ زندگی کا خواب نہ تھا

اتفاقات ہیں محبت کے
کل یہی قلب باریاب نہ تھا

ہوگئی جب نگاہ کی تکمیل
کوئی چہرہ پسِ نقاب نہ تھا

مصلحت یا لحاظ جو سمجھو
ورنہ کس بات کا جواب نہ تھا

کون سے شہر میں نہیں تھی ریا
کون سے دشت میں سراب نہ تھا

دُھوپ میں دُور تک نہ تھا سایہ
اَور ظُلمت میں آفتاب نہ تھا

کس نظر میں نہیں تھی حیرانی
کون سے دل میں اضطراب نہ تھا

ہم جو موضوع بن گئے شوکتؔ
کیا کوئی عشق میں خراب نہ تھا

جو قلب تجربۂ غم سے بہرہ یاب نہیں
ہے ایک سادہ ورق مُستند کتاب نہیں

ھزار بار زمانے نے رنگ بدلا ہے
ہمارے حق میں مگر کوئی اِنقلاب نہیں

تمام حسنِ نظر کا طلسم ہے دُنیا
ترا جمال نہیں ، یہ مرا شباب نہیں

جنہیں شعوُر میسّر ہے آرزو کا تری
ترے بغیر انہیں کوئی اضطراب نہیں

ہے چشمِ یار سلامت تو لے شمار نشے
نہ ہو شراب کدوں میں اگر شراب نہیں

ہُوئے جو شعر شریک بیاض ہیں شوکتؔ
گل ایک شاخ کے ہیں ، شرطِ انتخاب نہیں

○

مُدعی خوش کہ ہے وُہ مردِ یگانہ پیدا
اَور ہمیں چاہ کرے ھم سا زمانہ پیدا

ہر فسانے میں حقیقت کا کوئی شائبہ ہے
ہر حقیقت سے بالآخر ہے فسانہ پیدا

ہر جواں قلب کسی شوخ نظر کی زد میں
یہ وُہ نخچیر کرے آپ نشانہ پیدا

آنکھ کے وصف سے بھی حسن نمایاں ہے مگر
عشق کے دم سے تو ہے آئینہ خانہ پیدا

ہو مقدّر میں اگر حسنِ طبیعت کا صلہ
آپ کر لیتے ہیں حالات بہانہ پیدا

طائرِ شوق ھُما وہ جو کرے بال کشا
ہو بیابانِ لق و دق میں خزانہ پیدا

شوکتؔ اِک کیف فزا شعر میں ڈھل جاتی ہے
کیفیت جب ہو کوئی مضطربانہ پیدا

یہ شاخِ گُل کے ساتھ نہ شاخِ شجر کے ساتھ
ہے سلسلہ بہار کا سارا نظر کے ساتھ

کوئی بھی اَب نہ آئے گا اُمیّد گاہ میں
اک گردِ بے سوار ہے ھر رہگذر کے ساتھ

منزل کو جانتے ہیں اگر کارواں عزیز
کیا سوچ کر روانہ ہُوئے راہبر کے ساتھ

دم خم تھا بازؤں میں کہاں شکر ہے ندیم
صیّاد نے رہا نہ کیا بال و پَر کے ساتھ

فرطِ اُمید، ذوقِ تمنّا، ہَوائے شوق
کیا سلسلے ہیں زندگی مختصر کے ساتھ

ھم کو ملی ہے دولتِ تسکین لازوال
بیٹھے جو دو گھڑی کسی آشفتہ سر کے ساتھ

وُہ ساکنانِ شہرِ وفا کیا ہُوئے کہ اَب
کوئی بھی دُور دُور نہیں اپنے گھر کے ساتھ

یارو کرو تو سیرِ نہاں خانۂ ضمیر
جامِ خلوص رکھ کے چراغِ نظر کے ساتھ

شوکتؔ رہے گا یاد پشاور کا میکدہ
جامِ وفا کے دَور حفیظ اثر کے ساتھ

جس قدر مسئلۂ عقل میں ہم تام ہُوئے
ذہن و دل اَور بھی سرگشتۂ اوہام ہُوئے

قابلِ دار نہیں جوہرِ جرأت مندان
قابلِ داد ہیں جو جُرم سرِ عام ہُوئے

چند کرنوں کے طلبگار ہیں سائے کی طرح
ہم سے جو ہنس کے ملا بندۂ بے دام ہُوئے

ماہیت ایک ہے جلوؤں کی حرم سے دل تک
تم وہی ہو پسِ پَردہ کہ سرِ بام ہُوئے

دل دمِ صبح ستاروں کی طرح ڈوب نہ جائیں
شمعِ اُمید سے روشن تو سرِ شام ہُوئے

ہُوا کہیں سایہ کسی ذات کا منّت کش ہے
شوکتِ شعر سے ہم قائل الہام ہُوئے

ہُوا ہے دیکھتے ہی دیکھتے شباب کو کیا
خنک ہے جیسے کوئی شعلۂ جمالِ حنا
جمُودِ ظلمت ابہام ہے محیطِ حواس
نمودِ صبح کی مانند مُسکراؤ ذرا!
حریمِ دل میں تمنّا طواف کرتی رہی
تمام عمر نہ معلوم ہو سکا کس کا
نظر کے ساتھ ہے پیوست آئینہ کوئی
کہ دیکھتا ہوں تماشا ہر ایک سمت اپنا
کسی نے کس کی توجّہ سے کوئی بات سنی
ہم آپ سنتے رہے ہیں ندیم اپنا کہا
نہیں ہُوئے ہیں کبھی اپنی ذات سے گمراہ
ہر ایک شخص دکھائی دیا ہمیں اچھّا
تمام طاقتِ برداشت چھین لی جیسے
ملا ہے جب کوئی ہمدرد درد اور بڑھا
ملا ہے کسب میں اپنے ہر ایک کامل تر
یہ جُستجو ہے کہ شوکتؔ کوئی ملے ہم سا

کوئی حسرت تو اے خُدا نکلے
وُہ نہیں آئے، موت آ نکلے

ہم رہے فکرِ رہبراں میں اسیر
ہم سفر منزلوں پہ جا نکلے

آپ کو ہم بہار سمجھے تھے
آپ اُس سے بھی خُوشنما نکلے

کیا تمہیں فرصتِ جواب نہ تھی
دے کے ہر در پہ ہم صدا نکلے

زندگی کی قلیل مُدّت میں
کوئی ارمان دل کا کیا نکلے

کیا خبر ہے گناہگارِ عشق
حشر میں سب سے پارسا نکلے

لازماً مستجاب ہوتی ہے
دل سے شوکتؔ اگر دُعا نکلے

کام سے اپنے رہا کرتا ہے اَب کام مجھے
اِس لیے لوگ سمجھتے ہیں نکو نام مجھے

جسم کے درد کو میں دل میں سمو لیتا ہوں
اپنے آغوش میں مل جاتا ہے آرام مجھے

میں کہ ہوں زائرِ ایمن کدۂ طلعتِ دوست
روک سکتا ہے کہیں جلوۂ ہر بام مجھے

یہ جوانی کہ ہے اَب رنگ پریدہ تصویر
ہاں کبھی لوگ کہا کرتے تھے گلفام مجھے

دُھوپ سرما کی بنی جاتی ہے کیفیّتِ خُوں
زندگی ہوتی ہے محسُوس اِک الزام مجھے

رنگِ گُل، جلوۂ محبُوب، ضیائے بادہ
ہر کرشمہ نظر آتا ہے بڑا خام مجھے

آنکھ کی مَے سے بمشکل کبھی ہوتا تھا نشہ
بس ہے اَب مستیٔ پیہم کے لیے جام مجھے

شعر گوئی میں تصنع نہیں مسلکِ شوکتؔ
میں وہی کہتا ہوں ہوتا ہے جو الہام مجھے

○

ہمسفر رہ میں ہُوئے جو سرِ منزل نہ ملے
مل گئے ہیں بڑے آساں جو بمشکل نہ ملے

ہم بچھڑ جائیں تو ممکن ہے کچھ اخلاص بڑھے
مدتوں ساتھ رہے دوستو اور دل نہ ملے

مندمل یہ تو ہُوئے جاتے ہیں سب وقت کے ساتھ
زخم سینے میں ہمیں داد کے قابل نہ ملے

جو نہ گردابِ بلاخیز کا ہم رقص ہُوا
اس سفینے کو خدایا کبھی ساحل نہ ملے

بارہا ہم رہے ہنگامۂ عالم میں شریک
بارہا کشمکشِ ذات میں شامل نہ ملے

مستقل چلتا رہے قافلۂ شوق و طلب
مجھ کو تو، رند کو مے، قیس کو محمل نہ ملے

مُوردِ ننگ نہیں ہے ہمیں شوکتؔ یہ کمال
ڈھونڈ آئے ہیں کہیں مردمِ کامل نہ ملے

اے حسنِ نارسا تیرا دائم خیال ہو
اِس سے غرض نہیں کہ میسّر وصال ہو

محسُوس ہو رہا ہے یہ آئینہ دیکھ کر
جیسے مرے قریب ہی تیرا جمال ہو

ساقی شراب پی کے مجھے ہوش آ چلا
ساقی نظر اُٹھا مرا نشّہ بحال ہو

گُل مختصر کھلے یہ مگر ہو مشامِ جاں
محبُوب بے وفا ہی سہی خوش خصال ہو

حکمِ سفر ہمیں تو ملا میکدے سے خیر
لیکن مزاجِ پیرِ مغاں کیوں نڈھال ہو

تم آئینے میں دیکھ کر مجھ کو بھی دیکھنا
ممکن ہے کوئی اور تمہاری مثال ہو

شوکتؔ تمام عمر رہا ہے یہی سلُوک
بے مہریٔ ندیم سے اَب کیوں ملال ہو

○

سُورج کی کرن پا کے کُرہ چاند سا چمکا
یہ قلب تو گُل چیں ہے تری چشمِ کرم کا

لغزش تو مجھے ورثۂ آدم میں ملی ہے
میخانہ بھی ساقی کوئی گوشہ ہے اِرم کا

صحبت نے بدل دی ہے عناصر کی روش بھی
باعث سرِ تسلیم ہے محراب کے خم کا

عالم پسِ عالم متلاشی ہیں سکُوں کے
ذرّہ ہے کہ خورشید مگر اِذن ہے رم کا

اربابِ غنا ہم کو حقارت سے نہ دیکھو
قطرے ہی کے دم سے ہے سماں شورشِ یم کا

اِنساں کا گذر پہلے بھی اس سمت ہُوا تھا
ہے نقش عیاں چاند کی چھاتی پہ قدم کا

اِس دَور میں تو مرگِ مفاجات سے آگے
کچھ اَور مداوا نہیں اِنسان کے غم کا

وُہ لوگ زمانے میں کہاں ملتے ہیں جن کو
غرّہ ہے مسرّت کا، نہ شکوہ ہے الم کا

اشکِ گُلِ تر پونچھ دیئے بڑھ کے کرن نے
فطرت کو نہ دھیان آیا مرے دیدۂ نم کا

شوکتؔ یہ تلمذ کا شرف کم تو نہیں ہے
پیدا نہ سہی شعر میں اسلُوب عدمؔ کا

○

مثلِ فانوس کہاں دھر لیے دامن میں چراغ
ہم بھی ہمراہ چلے گر لیے دامن میں چراغ

ہے دل و جاں میں ضیا تیری توجّہ کے طفیل
مہر کے دم سے ہیں اختر لیے دامن میں چراغ

ہمتیں پست ہُوئی ہیں تو کیا یاد تمہیں
جب ہوا تُند چلی، کر لیے دامن میں چراغ

باغباں واقعہ یہ بھی ہے پسِ بادِ نسیم
باغ میں آئی ہے صرصر لیے دامن میں چراغ

جل بجھے جس میں پرائی تو نہیں تھی وُہ آگ
صُورتِ شمع ہیں پیکر لیے دامن میں چراغ

تھی ہوائے لب و رخسار، ہمیں تو، ہم نے
جان کر شعلۂ گل بھر لیے دامن میں چراغ

جب جلی آنچ کی قندیل تو مے سرد پڑی
رہ گئے بزم میں ساغر لیے دامن میں چراغ

خوب لگتے ہیں چراغوں سے مزیّن در و بام
ہو گئے راکھ کبھی گھر لیے دامن میں چراغ

بچ گئے منت فانوس گراں سے ہم لوگ
دو گھڑی بھی نہ جلے مر لیے دامن میں چراغ

سامنا تُند ہواؤں کا بھی ہو گا شوکتؔ
تم چلے تو ہو گذر پر لیے دامن میں چراغ

دردکا وار کارگر نہ ہُوا
قتلِ احساس عمر بھر نہ ہُوا

وُہ غبارِ فضا میں ڈُوب گئے
جن کو اندازۂ نظر نہ ہُوا

منزلوں پر پہنچ گئے وُہ لوگ
جن پہ احسانِ راہبر نہ ہُوا

ارتکابِ دُعا کے مجرم پر
بے نیازی کا کچھ اثر نہ ہُوا

بیٹھنا ہے کہیں فقیروں کو
رہگذر ہے جو کوئی در نہ ہُوا

زندگی سے وُہ لمحہ خارج ہے
جو تری یاد میں بسر نہ ہُوا

کیا ہے گر کوئی رہ نہیں ہموار
کیا ہے گر کوئی ہمسفر نہ ہُوا

مُدّتیں ہوگئیں کہ دل کیطرف
شوکتؔ اُس شخص کا گذر نہ ہُوا

نظر سے رُوئے سخن ہے لبوں سے روئے خیال
مئے جمال سے لبریز ہے سبُوئے خیال
کوئی روانہ ہے پھر رہگذارِ ماضی پر
کسی کی چاپ سے نغمہ سرا ہے کوئے خیال
ترے خیال سے بے داغ ہے ضیائے بدن
ترے جمال سے وابستہ آبروئے خیال
گلہ طرازیٔ ناقدریٔ زمانہ کیا
سُنا کریں گے ہمیں اپنی گفتگوئے خیال
کہاں سے لائیں تمنّائے قلب کا محبُوب
کہاں پہ ڈھونڈیئے مقصُودِ آرزُوئے خیال
وصال و قُرب کے نشے حریفِ ہوشِ سخن
فراق و ہجر کی کیفیّتیں عدُوئے خیال
بہار اَب کے برس ہے جہان و جاں افزا
ہے ساتھ ساتھ نموئے گُل نموئے خیال
اُتر کے دیکھیئے شوکتؔ ضمیرِ انساں میں
تنک محیطِ تمنّا، وسیع جُوئے خیال

اے دوست وداع کی گھڑی ہے
تقدیر برہنہ سر کھڑی ہے
تا عمر رہے فریبِ اُمیّد
ورنہ تو یہ رہگذر کڑی ہے
جانے ہے وہی کشاکشِ عشق
جس پر یہ مصیبت آپڑی ہے
ھم اور تری نظر کے قابل
تقدیر مگر کہاں لڑی ہے
ہم یاد ہی کر رہے تھے تجھ کو
عمرِ اے غمِ دل تری بڑی ہے
جی کھول کے آج ہم بھی رولیں
برسات کی آخری جھڑی ہے
اِس شہر میں دام ہی نہیں ہیں
ہر گام صلیب بھی گڑی ہے
زُلفوں میں دمک رہی ہے افشاں
کیا رات میں دُھوپ سی جڑی ہے

○

لوگ کہتے ہیں کہ ہے ہم نفساں موسمِ گُل
ہم قفس زاد کہاں اور کہاں موسمِ گُل

یورشِ غم کا تسلسل ہے خزاں سے ورنہ
دل تو اِک پھُول ہے اور عمرِ رواں موسمِ گُل

ہے گُل و سبزہ میں ہنگامۂ اظہارِ نمو
کیوں مرے دل میں ہو مانندِ خزاں موسمِ گُل

تم مرے پاس بڑی دیر رہے تھے لیکن
آہ وُہ خواب گریزاں، گذراں موسمِ گُل

تھے کبھی باغ و بہار آدمی ہم بھی شوکتؔ
اَب طبیعت پہ گذرتا ہے گراں موسمِ گُل

○

بھولتے جاتے ہیں یادوں میں سمانے والے
جیسے اَب واقعی رُخصت ہوئے جانے والے

مست نظریں نہ رہیں دل میں اُترنے والی
شوخ گیسو نہ رہے ذہن پہ چھانے والے

مَے سے تکلیف میں ہے ذوقِ خمار آشامی
کیا ہوئے لوگ نگاہوں سے پلانے والے

وقت کو ساتھ لیے آئے یہاں تک ہم ہی
ہو گئے لوگ ہمیں اگلے زمانے والے

پیکرِ غم، صنمِ درد، بُتِ سوز اے دل
آ گئے سَب ترے آغوش میں آنے والے

تھا گراں جن پہ ترا ناز اُٹھانا اے دوست
ہو گئے غیر کا احسان اُٹھانے والے

آنکھ میں اَور بڑھی جاتی ہے وقعت اپنی
تو گرا اَور بھی نظروں سے گرانے والے

یہ جہاں ایک بڑے کھیل کا پس منظر ہے
سَب نظر آتے ہیں کردار فسانے والے

جو زمانے کی سماعت پہ گراں لگتی ہے
ہم تو شوکتؔ ہیں وہی بات سُنانے والے

قدریں بدل گئی ہیں ہماری حیات کی
کیا بات ہے تری نگہِ التفات کی

وُہ مست مست آنکھ جزیرہ ہے خواب کا
ماخذ وُہ شوخ شوخ نظر چاند رات کی

ہم سادہ دل فریب میں دانستہ آگئے
بے ساختہ کسی نے اگر ہنس کے بات کی

مفہُومِ زندگی کبھی واضح نہ ہو سکا
ترتیب منتشر ہی رہی واقعات کی

رسم و رہِ خلوص زمانے سے اُٹھ گئی
بدظن ہُوا وُہ جس سے محبت کی بات کی

لب کی لکیر سے خطِ پیمانہ تک دراز
کتنی حسیں حدیں ہیں مری کائنات کی

شوکت ہیں وُہ معرکہ نہ ہو اُن کا تذکرہ
ہم کو یہ ضد لکھیں گے غزل واردات کی

یاد میں تری حسیں طرزِ خیالات ہے اَور
ماہ وش ماہ جبینوں میں تری بات ہے اَور
سرمدی کیف مرے ذہن سے دل تک ہے محیط
جب سے دیکھا ہے تجھے عالمِ جذبات ہے اَور
معترض لوگ نظر آتے ہیں اس پر جب سے
تب سے ہم کو بھی یہ سودائے مُلاقات ہے اَور
یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وُہ مل بھی جائیں
آرزو چیزِ دگر، گردشِ حالات ہے اَور
زُلف لہراؤ بڑا گرم ہے ماحولِ شباب
تم نہیں ہو تو ستم خیز یہ برسات ہے اَور
اے مری زہرہ جبیں مسلکِ آزاد ہے عشق
اَور پابندئ آداب و روایات ہے اَور
ہے خرابات کے پہلو میں بھی شوکتؔ کچھ کیف
پہلوئے دوست میں ماحولِ خرابات ہے اَور

قلب و نظر کا قافلہ راہِ طلب میں ہے
رُوئے نگارِ صبح ابھی زُلفِ شب میں ہے

کر برملا جمالِ نظر کا مظاہرہ
میری نظر تجسسِ ہر تاب و تب میں ہے

آغوشِ دوست میں نہ ہُوئے باریاب ہم
ہم ہی میں کوئی بات نہ تھی اَور سب میں ہے

بوُ گُل سے، دود شمع سے، ہم خود سے پا گریز
ہر ایک چیز سعئ رمِ بے سبب میں ہے

ساغر بلب بھی عالمِ صد کیف ساز تھا
لیکن جو بات کیفیت لب بہ لب میں ہے

شوکت سرود خانہء مستاں نہیں خیال
ورنہ علاجِ درد حدیثِ طرب میں ہے

○

حسبِ معمول بہار آئی مچاتی ہوئی دھوم
قحطِ گُل پھر بھی ہے کیوں اہلِ چمن کا مقسُوم

لوگ ہیں یا کسی ویرانے کی روئیدگی ہیں
گُل سمجھ کر جسے چوُما وہی نکلا مسمُوم

جس قدر چاہتے ہیں جائیں بچا کر دامن
ہم پہ کرتی ہوئی آتی ہے ہر اِک چیز ہجُوم

مصلحت ہم کو وہیں مہر بلب کرتی ہے
جب کسی چیز کی ہوتی ہے حقیقت معلوُم

وُہ جو ناکام رہا کشمکشِ عمر کے بعد
اُس کو شاباش دے اُس شخص کی پیشانی چوُم

زندگی ہے کہ خدُایا کوئی نیرنگِ سراب
دیکھنے پائی نہ تھی آنکھ کہ منظر معدُوم

اَب سکوُں ڈھونڈھ کسی اَور ہی سیّارے میں
شوکتؔ اِس ارض کے اطراف میں بیکار نہ گھوُم

کیا جنوں لکھ دیا قسمت میں خدایا میری
زندگی بن گئی ہے ایک تماشا میری
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ محبت کیا ہے
اب یہ خواہش ہے کہ ہو تجھ کو تمنّا میری
میرا سرمایہ ہے دیروز کی مبہم یادیں
ہے بساط ایک امیدِ دمِ فردا میری
کائنات ایک سراپردۂ احساسِ جمال
اس میں کیا ڈھونڈھتی ہے چشمِ نظارہ میری
آئینے میں مجھے اِک عکس نظر آتا ہے
دیکھ تو بھی یہ تجلی ہے تری یا میری
گفتگو دوست سے یاروں پہ گراں ہے شوکتؔ
طبعِ خوش ذوق مسلسل ہے غزل زا میری

چیر دیں چرخ کو وُہ تیر بھی ہیں
نالے کچھ حاملِ تاثیر بھی ہیں

رُکنے دیتا ہی نہیں ذوقِ سفر
لاکھ منزل پہ عناں گیر بھی ہیں

جو نہیں حلقہ بگوشِ تقدیر
یاں وہی صاحبِ تقدیر بھی ہیں

زندگی ڈھونڈ رہی ہے اُن کو
آدمی صورتِ تصویر بھی ہیں

بزم سے تو نے اُٹھایا جن کو
وہی شائستۂ توقیر بھی ہیں

جو مرِ خواب نہیں ہیں شوکت
وُہ مرے خواب کی تعبیر بھی ہیں

ہم لے کے چراغ جا رہے ہیں
کیوں ٹھوکریں پھر بھی کھا رہے ہیں

اے ہم سفرانِ راہِ ہستی
ہم لوگ کہاں سے آ رہے ہیں

کیا بُجھ گئے دل، کہ راستوں پر
اَب لوگ دیئے جلا رہے ہیں

جو آج ملے ہیں اجنبی سے
ہم سے کبھی آشنا رہے ہیں

دائم تجھے حرزِ جان سمجھا
کس وہم میں مُبتلا رہے ہیں

ہم بھُول رہے ہیں خود کو شوکتؔ
شاید انھیں یاد آ رہے ہیں

جام و مے سے بے نیاز اُس آنکھ کا مستانہ تھا
میکدے میں کہتے ہیں ایسا بھی اِک دیوانہ تھا

گم تھا اِک صحرا میں وُہ ، ہم میں کئی صحرا ہیں گم
مت کہو دیوانہ ہم کو قیس گر دیوانہ تھا

اَب ہمارے بعد دیکھیں کون ہو پُرسانِ عشق
قیس سے ہم تک بڑا مربُوط یہ افسانہ تھا

کیا کسی کو بھی نہ راس آئی جہاں میں زندگی
یا ہمارے ہی لیے ماحول یہ بیگانہ تھا

ہم جسے کوتاہ بینی کے سبب سمجھے جہاں
غور سے دیکھا تو دل کے پاس اِک ویرانہ تھا

شمع کو دعویٰ بہت ہے انجمن آرائی کا
رنگِ محفل اَور ہی تھا جب یہاں پروانہ تھا

آپ کو ہم نے کیا محسُوس اکثر اپنے پاس
اُس زمانے میں بھی جب یوں آپ کا چرچا نہ تھا

وقت بدلا ہے تو بدلا ہے تمہارا بھی مزاج
آج تم کچھ بھی کہو شوکتؔ کو کل ایسا نہ تھا

○

تھی اوٹ جس کی لو پہ وُہ دامان اُٹھ گیا
تھوڑی سی روشنی کا بھی امکان اُٹھ گیا

آیا یقیں خدا پہ شکستِ اُمید سے
لیکن خود اپنی ذات پر ایمان اُٹھ گیا

باقی ہیں صرف آدم و حوّا کی میّتیں
اُترا تھا جو بہشت سے اِنسان اُٹھ گیا

وُہ شخص دل میں بیٹھ گیا درد کی طرح
کر کے کنارِ شوق جو ویران اُٹھ گیا

حق بات کہہ کے ھم تو پشیمان ہو گئے
ھم پر ہزار طرح کا طوفان اُٹھ گیا

شوکتؔ ہماری ایسے مسافر کی ہے مثال
رستے میں جس غریب کا سامان اُٹھ گیا

○

درد اَب بڑھ کے درد ہی نہ رہا
پھُول جب بن گیا کلی نہ رہا
دوستی کا مذاق ہے مذمُوم
ثقہ اسلُوبِ دُشمنی نہ رہا
درد خود دل نے انتخاب کیا
اَور پھر یہ ہنسی خُوشی نہ رہا
اَب ستانے لگے ہمیں حالات
کیا ترا دھیان واقعی نہ رہا
مطمئن زندگی بسر ہوتی
اَور تو کچھ جنوں کبھی نہ رہا
آشنا آج آشنا نہ بنا
اجنبی آج اجنبی نہ رہا
یا ہمیں ہی نہ مل سکا شوکت
یا جہاں ہی میں آدمی نہ رہا

○

مستی ہے کیفیت ہے، نشہ ہے شراب ہے
تری نگاہ بادہ کدوں کا جواب ہے

تری نظر کا کیف شرابوں کی آرزو
ترے لبوں کا رنگ گلابوں کا خواب ہے

اے دوست آج مل کہ ہے دل سخت گرمجوش
اے دوست آج آکہ نظر پر شباب ہے

واجب سہی تلاوتِ جام و نگار و گُل
دل کو بھی پڑھ کہ یہ بھی مقدّس کتاب ہے

آیا حدیثِ دل میں تری ذات کا بیان
اس کو سنا یہاں سے یہ دلچسپ باب ہے

ہر چیز پر جو آج مسلّط ہے بے حسی
شوکت زمانہ منتظرِ انقلاب ہے

کہیں سبُو ہے لبالب، کہیں پیالہ نہیں
اس امتیاز کا ساقی کوئی ازالہ نہیں

جو داستان لکھی آپ نے لہُو سے مرے
کہیں بھی اس میں ذرا سا مرا حوالہ نہیں

عجیب معجزہ ہے یہ شعُور و ہمت کا
کہ چاند زیرِ قدم ہے فقط ہمالہ نہیں

ازل سے جاری ہے یہ اونچ نیچ کا گھمسان
میانِ خلق یہ بحران چند سالہ نہیں

لباس اُبھرتا ہے تن کی برہنگی بن کر
اگر یہ اطلس و کمخواب کا دوشالہ نہیں

نہیں ہے نکتہ سزاوارِ گفتگو بے لاگ
سخن جو صاف ہے شائستۂ مقالہ نہیں

نہ دیکھ اتنی عقیدت سے اپنے مجرم کو
گلے میں طوق ہے چہرے کے گرد ہالہ نہیں

حدی ہے میری غزل محملِ گراں کے لیے
رجز کا نغمہ ہے شوکتؔ نوائے نالہ نہیں

ہم منزلوں کے نشاں رہے ہیں
گردِ رہِ کارواں رہے ہیں
کچھ ہم بھی رہے ہیں اپنے دشمن
کچھ آپ بھی مہرباں رہے ہیں
کشتی ہی نہ لگ سکی کنارے
دریا تو بہت رواں رہے ہیں
جب تم ہمیں یاد آگئے ہو
اے دوست تو ہم کہاں رہے ہیں
معلوم یہ اَب ہُوا کہ باہم
حائل ہمیں درمیاں رہے ہیں
یوں بھی نہ یہ بستیاں اجاڑو
کچھ لوگ کبھی یہاں رہے ہیں
شوکتؔ وہی حسُن و عشق کے گیت
ہم بھی تو فسانہ خواں رہے ہیں

○

کب وارداتِ زیست میں عظمت نہیں رہی
انسان کے مزاج میں وسعت نہیں رہی
بے کار مشغلوں میں بسر ہو گئی حیات
فرصت اگر رہی بھی تو فرصت نہیں رہی
دُنیا سے اُٹھ گئی ہے رہ و رسمِ دوستی
دل میں تو کیا نظر میں مروّت نہیں رہی
پُختہ ہوا ہے اس کا عقیدہ ہر ایک پر
جب آدمی سے خود کو عقیدت نہیں رہی
ہم ہر محاذِ زیست پر مصروفِ جنگ ہیں
شاید نظر میں اپنی حقیقت نہیں رہی
رہبر نے خود ہی کر دیا کم قافلے کا بوجھ
اب راہزن کی کوئی ضرورت نہیں رہی
شوکتؔ تھے ہم بھی باغ و بہار آدمی کبھی
کیا ہو گیا کہ اب وُہ طبیعت نہیں رہی

زندگانی کو دُور سے مت دیکھ
تلخ کتنی ہے یہ حقیقت دیکھ

ہو رہے ہیں کہیں جُدا احباب
اُٹھ رہی ہے کہیں قیامت دیکھ

درد کو خود بخود قرار ہوا
درد کی انتہائی صورت دیکھ

دل کو تیرے بغیر ہے آرام
ہوگئی ہے عجیب حالت دیکھ

پھول ہنس کر خزاں سے ملتے ہیں
مرنے والے میں اتنی جرأت دیکھ

کر رہے ہیں غلط زمانہ غلط
محتسب میکشوں کی نیّت دیکھ

علم سے جتنی روشنی پھیلی
اس قدر بڑھ گئی ہے ظلمت دیکھ

وصل کا سا سرُور ہے طاری
ہے تصوّر میں کتنی شوکت، دیکھ

○

مرے ہمدرد اَب کہیں نہ رہے
تھے جو کچھ لوگ نکتہ چیں نہ رہے

کیوں کسی آنکھ کی خوشامد ہو
مے نہیں ہے کہ ساتگیں نہ رہے

ہجر کی رات کتنی آساں ہے
گر تری بات پر یقیں نہ رہے

دھجّیاں جن کی تھا لباسِ بہار
وُہ گریبان و آستیں نہ رہے

وضعدار اَب کوئی نظر نہ رہی
وُہ طرحدار اَب حَسیں نہ رہے

ہم رہے ہیں کہاں، نہیں معلوم
بس یہ معلوم ہے کہیں نہ رہے

تھی کبھی اپنی بات جی لگتی
شوکتؔ اَب شعر دلنشیں نہ رہے

نہیں ہے عشق جو سالارِ قافلہ کیا ہو
دل و نگاہ کا طے سارا فاصلہ کیا ہو
ہم اپنے آپ ہی دُشمن تمام عمر رہے
ہو کوئی اَور بھی دُشمن اگر گلہ کیا ہو
جُھکے نہ ہم تو زمانے نے ہم کو توڑ دیا
اَب اس سے بڑھ کے کسی کا مقابلہ کیا ہو
جنوں نے طول تو کھینچا ہے تیرے گیسو تک
دراز اَور میری جاں یہ سلسلہ کیا ہو
قمیص عصمتِ یُوسف کی کیا سند بنتی
جو مُدعی بنے منصف تو فیصلہ کیا ہو
ہُوئے حریف بھی چھوٹے دل و دماغ کے لوگ
اَب اُن کے ساتھ ہمارا معاملہ کیا ہو
ہمارے دم سے اندھیرے تلف ہُوئے شوکتؔ
اَب اَور روشنئ طبع کا صلہ کیا ہو

○

اے دردِ ہجر تازہ غزل گنگنائیں گے
ہم آج جشنِ مرگِ محبت منائیں گے

اربابِ حُسن ہم سے کشیدہ ہیں آجکل
اربابِ عشق آج ہمیں آزمائیں گے

تُو نے ہمیں فریب دیا ہے وثوق سے
ہم بھی بڑے خلوص سے یہ زخم کھائیں گے

دل کر رہا ہے عرضِ تمنّا کچھ اس طرح
جیسے وُہ اس کی بات کبھی مان جائیں گے

جب دل کا نُور دے نہ سکا ساتھ آنکھ کا
کیا یہ چراغِ راہ گذر کام آئیں گے

ہرچند لوگ سن کے فسانہ کریں گے فرض
ہم واقعہ وثوق سے لیکن سنائیں گے

شوکتؔ غمِ فراق میں یوں دل گرفتہ ہیں
جیسے تمام عمر نہ اَب مسکرائیں گے

ساری حیات عشق کے بس میں گذر گئی
یہ واردات شعلہ و خس میں گذر گئی
وُہ فرصت عزیز جسے زندگی کہیں
بے کار آرزو و ہوس میں گذر گئی
کتنی ہماہمی تھی جوانی کی دوستو
کمبخت ہائے چند برس میں گذر گئی
سر سے ٹلا ہزار بلاؤں کا وسوسہ
یعنی بڑے مزے سے قفس میں گذر گئی
کچھ رات قافلے کو رہا نیند کا خمار
کچھ انتظارِ بانگِ جرس میں گذر گئی
شوکت بپا ہے ذہن میں آہنگِ سرمدی
کس کی صدا یہ سازِ نفس میں گذر گئی

○

عالمِ جبر میں بھی سرکش ہے
ہمت آدمی پہ عش عش ہے
مرنے والو حیات کچھ بھی نہیں
یاس و اُمید کی کشاکش ہے
اپنے فتراک سے مراسم ہیں
آئیں جن کی نظر میں ترکش ہے
کوئی رندِ شراب خانۂ چشم
کوئی بد ذوق صرف میکش ہے
پھول، ذرہ، نظر، کرن، تارہ
ہر طرف طورِ اہلِ بینش ہے
ہے کس الہڑ کا خندۂ بیجا
جو ہر اک پھول پر منقش ہے
حسن کو شوقِ خود نمائی تھا
اور کیا وجہ آفرینش ہے
شوکتؔ اس سے لگایئے اب لو
دل کے نزدیک جو پری وش ہے

○

بکھرے تو پھر بہم مرے اجزا نہیں ہوئے
سرزد اگرچہ معجزے کیا کیا نہیں ہوئے

جو راستہ میں کھیت نہ سیراب کر سکے
کیوں جذب دشت ہی میں وُہ دریا نہیں ہوئے

انسان ہے تو پاؤں میں لغزش ضرور ہے
جرمِ شکستِ جام بھی بے جا نہیں ہوئے

ہم زندگی کی جنگ میں ہارے ضرور ہیں
لیکن کسی محاذ سے پسپا نہیں ہوئے

طوفاں جو ناخداؤ اُٹھے ہیں نظر میں ہیں
سوچو تم اُن کی جو ابھی برپا نہیں ہوئے

اِنساں میں اَب تو مدتوں ھم دیوتا رہے
شکلیں نہیں بنیں جو ہیولیٰ نہیں ہُوئے

ٹھہرو ابھی یہ کھیل مکمل نہیں ہُوا
جی بھر کے ہم تمہارا تماشا نہیں ہُوئے

ہر سَر سے آسمان کی چھت اُٹھ نہیں گئی
کب تجربے میں شہر یہ صحرا نہیں ہُوئے

بازار میں ہر ایک بھی گاہک نہ بن سکا
تھے مالِ پُر طلب پہ مہیّا نہیں ہُوئے

شوکتِ دیارِ شوق کی رونق انہی سے ہے
جو لوگ اپنی ذات میں تنہا نہیں ہُوئے

بات پھیلے گی کر نہ سرگوشی
پیش خیمہ ہے غل کا خاموشی

جب جگانے کو آئی بادِ سحر
اور بھی بڑھ گئی ہے بے ہوشی

ہے عتاب و حجاب کا منظر
سرد مہری و گرم آغوشی

ابتدائے شعور ذوقِ سخن
انتہائے شعور خاموشی

سرد ہیں جسم و جاں کے ہنگامے
آبلہ پائی ہے نہ سرجوشی

شوکتؔ ایسی بھی سادہ لوحی کیا
جو نمائی و گندم افروشی

کیا کہیں دیوانہ ہے یا آج فرزانہ ہے دل
یوں ہمارے بعد جو اُن سے بھی بیگانہ ہے دل

موجزن ہے یاں کشاکش کا محیطِ بیکراں
گو بظاہر سرنگوں سا ایک پیمانہ ہے دل

سونپ رکھے ہیں خُدا کو ہم نے اپنے کاروبار
گر زمانے سے ہراساں ہے تو دیوانہ ہے دل

آنکھ ہے جس کی تجلّی گاہ وُہ پرتو ہے کیا
وُہ حقیقت کون سی ہے جس کا افسانہ ہے دل

کتنی خواب انگیز زُلفوں کا شبستاں ہے دماغ
کس قدر مسحور کُن آنکھوں کا میخانہ ہے دل

ڈُوب کر لکھتا ہے اپنی ذات میں تیری ثنا
گو بظاہر مدح خوانِ حسنِ جانانہ ہے دل

ذہن ہے اک غیر ممکن رات کا خواہش کدہ
ایک بے اِمکاں سحر کا آرزو خانہ ہے دل

ہو قبُولِ دوست گر شوکتؔ زہے عزّو شرف
آستانِ عالیہ پر صرف نذرانہ ہے دل

کچھ درد ہو کوئی یاد آئے
دل پر ہمیں اعتقاد آئے
کس سے نہ چھٹے وطن سے چھٹ کر
لیکن ہمیں آپ یاد آئے
کعبے سے بھی بے مراد لوٹے
تم سے جو نہ بامراد آئے
اُن سے ہے توقعِ جراحت
جو زخم کی دینے داد آئے
مرنے پہ بھی اعتبار ہوگا
جینے پہ تو اعتماد آئے
بے جا ہے مغالطہ یہ شوکتؔ
کرنے ہمیں کوئی شاد آئے

چپ کیوں لگے کچھ ایسی کہ چہرہ زباں بنے
اَب بن رہی ہے کوئی حکایت تو ہاں بنے

یں جن میں ہر لحاظ سے ہوں مرکزی خیال
دلچسپ ہیں، مگر یہ فسانے کہاں بنے

شاید سفر ہی شرط ہو تنہا روانہ ہو
ممکن ہے چلتے چلتے کہیں کارواں بنے

یارب نئی فضا کہ کہیں عافیت ملے
مُدّت ہُوئی زمین کو تو آسماں بنے

اللہ رے اہتمام یہ دل کے لیے، کہ لوگ
ناصح بنے، رقیب بنے، دلستاں بنے

عرصہ ہُوا کہ سُود و زیاں سے ہے بے نیاز
اَب دل کا کوئی رنگ بھی اے مہرباں بنے

شوکت حسد کا صید ہیں ہم، اَور ہیں جو لوگ
کسبِ کمال کر کے عزیزِ جہاں بنے

○

تو ہے تو تمنائے دگر کر نہیں سکتا
دانستہ میں ایماں کا ضرر کر نہیں سکتا

ہر سمت فراواں ہیں خرد خیز نظارے
تو ہی انہیں مخصوص نظر کر نہیں سکتا

ہر چند ہو خورشید پس پردۂ صد ابر
کیا شب سے نمودار سحر کر نہیں سکتا

اُس شخص کو مت جانئے اربابِ نظر سے
جو خاکِ وطن کحل بصر کر نہیں سکتا

ہر پھُول میں خوشبُو ہے نہ ہر اشک میں اخلاص
ہر لفظ طبیعت پہ اثر کر نہیں سکتا

کوئی غمِ جاناں سے نکلتا ہے سرافراز
کوئی غمِ دُنیا سے مفر کر نہیں سکتا

شوکت ہے دل و جاں میں کوئی حرف نہاں سا
عام اُس کی ہر اک بات مگر کر نہیں سکتا

دہر سے مٹنے کا غم بھی ہمیں بے جا ہوگا
ہم نہیں ہوں گے اگر کل، کوئی ہم سا ہوگا

دیکھ اُس آنکھ کو، حُسن اُس کا قصیدہ ہم سے
پھر یہ باتیں، نہ کبھی ایسا تماشا ہوگا

تُو بھی انسان ہے، تُو نے بھی محبت کی ہے
تُو محبت کے تقاضوں کو سمجھتا ہوگا

مرمٹا کون سے انداز پہ تیرے دل آج
اس نے سو بار تجھے پہلے بھی دیکھا ہوگا

آج تک ذہن میں حسرت کا غُبار اُڑتا ہے
آرزوؤں کا کبھی قافلہ گذرا ہوگا

آج خالق ہے جو ہر کھیت کی ہریالی کا
یہی قاتل کبھی ہر برگ و ثمر کا ہوگا

اَور کیا ہوگا پسِ پردۂ دل اے شوکت
اپنی تصویر کا اِک اَور سراپا ہوگا

حسین جشن، نہ اَب دلپذیر ہنگامے
کہ اِنقلاب کے داعی ہیں خونچکاں خامے
مذاق اُڑاتے ہیں ظالم برہنہ کانٹوں کا
پہن کے آتے ہیں جو پھُول خُوشنما جامے
نہ سوز اَب قدمے ہے نہ سازاَب سخنے
ہے کامگار محبت بھی درہمے دامے
عجب مزاج ہے مرے ستم ظریف کا بھی
سدا جفا بسلامے، وفا بدشنامے
نہ دشمنوں ہی سے دُشنام کا پیام کوئی
نہ دوستوں ہی کے آتے ہیں دل شکن نامے
پھر ایک زُہد شکن ہم جلیسِ خلوت ہے
نظر نوازے، سخن پرورے، دلآرامے
ہمارے دم سے بڑی رونقیں رہیں شوکتؔ
دلوں میں تازہ ہیں "اُردو سبھا" کے ہنگامے

دل لہُو نے بجر، مے نے ساتگیں خُم کر دیا
چند بوندوں نے بپا کیسا تلاطم کر دیا

دوستو ہم بھی جیالے تھے مگر حالات نے
رفتہ رفتہ ہم کو اپنے آپ میں گم کر دیا

پُوچھئے کس سے چمن میں گریۂ شبنم کا حال
پھُول نے تو بات سے پہلے تبسّم کر دیا

نیستی میں ڈُوب کر اُبھرے کبھی اہلِ سلُوک
خود کو ہستی میں کبھی بے ساختہ گم کر دیا

شوکتؔ اُن کے سحر پر کیا کیا مغنی کو ہے رشک
ہم نے جن لفظوں کو پابند ترنم کر دیا

علم اِنساں جو اسی طورِ فراواں ہوگا
علم رہ جائے گا کل اور نہ اِنساں ہوگا

ہائے وُہ دل جسے آغوش میسّر نہ ہُوا
ہائے وُہ پھُول کہ بیرونِ گلستاں ہوگا

ہے تجھے اپنی ہُنرمندیٔ تخلیق پہ ناز
آدمی بھی نہ گناہوں پہ پشیماں ہوگا

کون بازار زمانہ میں گراں ہے ہم سے
کون ہے جس کا لہُو ہم سے ہی ارزاں ہوگا

زخم ہو جائے گا تازہ نہ رکھو تم پھاہا
تم نہ دو دل کو تسلی یہ پریشاں ہوگا

دوستو بات بنے گی تو بگڑ کر اپنی
کام ہو جائے گا دشوار تو آساں ہوگا

شوکتؔ اس شوخ کی آنکھوں میں نہ جھانکو اتنا
آئینہ خانے میں دل اَور بھی حیراں ہوگا

عمرِ رواں کی قلبِ حزیں یادگار ہے
ماضی ہے جس میں دفن یہی وُہ مزار ہے

جیسے تمام حسن اسی کی ہے کائنات
آغوشِ فرطِ شوق میں یوں بیکنار ہے

تیرے فراق میں تھا مُلاقات کا سرُور
تیرے قریب ہو کے بڑا اِنتظار ہے

خود سے گذر کہ لوگ ترا غم غلط کریں
دیوانہ ہے جو شخص یہاں ہوشیار ہے

تمہید ہے، ابھی نہ فسانہ تمام کر
مانا بلیغ بات کا حسن اختصار ہے

شاید تمہیں نے پہلے کیا ہو یہ تذکرہ
جو آج مجھ سے سن کے تمہیں ناگوار ہے

گذرا انہی کے ساتھ بڑا دلفریب وقت
جن دوستوں کی یاد طبیعت پہ بار ہے

ہر شعر میں یہاں کی لطافت بسی ہُوئی
ھر شعر نذرِ وادیٔ پاراچنار ہے

ماخذ مری غزل کا کوئی بھی حسین ہو
شوکتؔ عدم سے طرزِ بیاں مستعار ہے

○

لہُو کہاں جو بکھر جائے دل کا شیرازہ
اگرچہ ضرب بھی کاری ہے زخم بھی تازہ

سدا یہ پھُول کی نشو و نما میں ہے مشغول
نموئے خار کا کیا باغباں کو اندازہ

نہ ہو سکا کبھی سرزد وُہ معجزہ اُن سے
تمام شہر میں ہے عام جس کا آوازہ

عجیب حبس ہے ان کھڑکیوں کو کھول بھی دو
ہے جاں کا خوف اگر بند کر لو دروازہ

ہے شاخسانۂ قحطِ طلب فراوانی
یہ حادثہ نہیں فرطِ ہوس کا خمیازہ

زمیں کے جسم کا سب رس نچوڑ کر انساں
چلا ہے چاند کے چہرے کا نوچنے غازہ

ہمارے کھیل کا یہ المیہ ہے اے شوکت
تمام کہنہ ہیں کردار ، داستاں تازہ

○

جیسے ہم اپنی گمشدہ ہستی سے جا ملے
شوکتؔ اَب اُن سے مل کے ہمیں اور کیا ملے

یوں جسم آج تری تمنّا سے چُور ہے
جیسے خمارِ مے کی ہوس میں سوا ملے

مت ٹھہر لاکھ راہ میں ہوں رہزنوں کے غول
مت چل جلو میں خضر اگر رہنما ملے

سایہ نہ بن اگرچہ ہے یہ عافیت کا خول
بزدل نہ ہو جو ردِ عمل ذات کا ملے

ہم نے حریف بھی کئے تسلیم باتمیز
مانیں نہ ہم حبیب نہ گر آپ سا ملے

ہم نے کبھی جو کی ہے تلاوت اُس آنکھ کی
سارے رموزِ ہوش و نشہ ایک جا ملے

شوکتؔ ریاضِ دہر کا ہم ہیں عجیب پھُول
مہکیں جو سازگار نہ آب و ہوا ملے

○

ساری دُنیا مری غمخوار ہُوئی جاتی ہے
زندگی اَور گراں بار ہُوئی جاتی ہے

ناخُدا ترے سبب میرے سفینہ کے لیے
نرم رو موج بھی تلوار ہُوئی جاتی ہے

تجزیہ موت کا آسان ہوا جاتا ہے
جس قدر زندگی دشوار ہُوئی جاتی ہے

ہوسِ ذوقِ قد و زُلف بنی شیوۂ عام
ختم رسمِ رسن و دار ہُوئی جاتی ہے

ایک دوشیزہ جسے ہم سے تعارف بھی نہیں
راحت و رنج کا معیار ہُوئی جاتی ہے

کس کی آنکھوں کی چمک، کس کے بدن کی خُوشبو
مے کی ضو، پھُول کی مہکار ہُوئی جاتی ہے

شوکت اَب شعر میں شامل ہے اِک آواز کا رس
اَب مری شاعری شہکار ہُوئی جاتی ہے

کانوں میں جو نغمات کا رس گھول رہا ہے
وجدان ہے یا تو مری جاں بول رہا ہے
یہ دل کہ تری ایک نظر پہ ہے نچھاور
ہر حسن کے بازار میں انمول رہا ہے
تاپی تو سہی آگ گھروندے کو جلا کر
اَب راکھ میں کیا رکھا ہے جو رول رہا ہے
جو گردنیں لمبی ہیں وُہ اَب ٹوٹ رہی ہیں
جو اُونچا سنگھاسن ہے وُہ اَب ڈول رہا ہے
چنگل میں لیے پھینکے گا کس کوہِ ندا پر
یہ وقت کا سیمرغ جو پر تول رہا ہے
شوکتؔ نہ قبا زیست کی چسُت آئی کہ اس میں
پیوند اگر ٹانک دیا، جھول رہا ہے

حال وُہ ہو گیا بدذوقیٔ انسانی کا
نہ رہا طبع کو میلان غزل خوانی کا
آج کیوں قلب ہے راحت کے لیے رنجیدہ
کل تک اُس کو تھا مزہ غم کی فراوانی کا
آج ہے کیسی زلیخاؤں میں یُوسف نیلام
یہ جو بازار میں آوازہ ہے ارزانی کا
پادشاہی کے خدوخال کی رونق ہے وہی
دور کہنے کو ہے جمہُور کی سُلطانی کا
شاخِ گُل ڈستی ہے افعی کی طرح نظروں کو
اس قدر قصّہ ہے گلچیں کی بدعنوانی کا
وائے وُہ موسم گُل جس میں خزاں یاد آئے
ہائے نقشہ جو بھرے گھر میں ہو ویرانی کا
کس کڑے دَور میں یاں سہل گذاری ہم نے
ہم پہ الزام مگر آیا گراں جانی کا
سادہ لَوحی کہ ہمیں اُن سے ہے امرت کی ہوس
جو کسی مرتے کو اک گھُونٹ نہ دیں پانی کا
سنگ زن ہم پہ وہی طفل ہیں شوکت جو کبھی
ہم سے لیتے تھے سبق چاک گریبانی کا

ہم نے لکھے گیت تمہارے، ہم نے سہرے گائے
جیسے چڑھے برات آنے پر ایسے جشن منائے

تو میرا آدرش ہے اے محبوب ہمیشہ میں نے
پھول سمجھ کر پہنے تو نے جو بھی زخم لگائے

ہم رستہ تھے تو نے ہم کو گردِ راہ بنایا
ہم تو جانِ بدن تھے تیری، آج ہوئے ہیں سائے

اے ہیروں کے تاجر تو نے ہم کو کنکر سمجھا
ہم نے تیری شوبھا کی خاطر سب روپ گنوائے

بھولے راہی سوچ رہے ہیں ایک کھنڈر پر بیٹھے
کن رستوں سے ہو کر گذرے، کس منزل پر آئے

ہم شمعیں ہیں ہم سے یہ کرنوں کا تانا بانا
ہم محفل سے اُٹھ جائیں تو گھور اندھیرا چھائے

ہم جنگل کی گونج نہیں ہیں ہم ہیں چیخ جنوں کی
ہم نے بے حس دل ہی کیا مرحوم ضمیر جلائے

تو ہے سپیرا تری بین پر ہم بانبی کے باسی
جھوم رہے ہیں ہم نے مانا لیکن پھن پھیلائے

تم جس کو چاہو اپناؤ جس کو چاہو پوجو
شوکتؔ اُس سے بچ کر چلنا جو تم کو اپنائے

اہلِ جہاں سے آس اُٹھی اَب تری ذات رہ گئی
یا تو رہی اَب اُن کی بات یا مری بات رہ گئی

زیست بھی واردات تھی، موت بھی واردات ہے
مر کے بھی جان کے لیے فکرِ نجات رہ گئی

ہم نے تو زندگی میں ہی اپنے عمل بھگت لیے
کون سی پرسش اور اَب بعدِ ممات رہ گئی

ڈوب کے بارہا مری کشتیٔ دل اُبھر پڑی
سہم کے بارہا مری نبضِ حیات رہ گئی

سنتے اگر تو داستاں میری بھی دلفریب تھی
آپ کا ذکر آگیا، بات میں بات رہ گئی

شوکتِ سخت جاں یونہی ہم رہے گرمِ جستجو
تھک کے سحر پلٹ گئی، ہار کے رات رہ گئی

سفر دراز بھی ہے ، رہگذار سخت بھی ہے
شریکِ قافلہ اِک بے نیازِ رخت بھی ہے

ہے دُھوپ تیز، لق و دق ہے رہگذارِ حیات
مری نظر میں مگر سایۂ درخت بھی ہے

جو ہو سکا نہ محلّات میں قدم رنجہ
وُہ شخص وارثِ ارباب تاج و تخت بھی ہے

مرا لہُو ، مری دانشوری ، مری ننگ و ناز
بتا کہ کوئی مداوائے سوئے بخت بھی ہے

لہُو کا کھیت بھی ہے دل، ہزار ہو گلگوں
جڑاؤ ہار سہی جسم، لخت لخت بھی ہے

نیاز مند سے تم کو ہے نغمگی کی طلب
کڑے ہیں بول بھی، لہجہ مرا کرخت بھی ہے

ملائم انگلیاں شوکتؔ کہ ہو قلم سے فگار
بپھر گئیں تو انھی کی گرفت سخت بھی ہے

دل و دماغ و نگاہ و احساس جو دیا منتشر دیا ہے
عجیب بکھرے ہُوئے عناصر سے مجھ کو مربُوط کر دیا ہے

بہشتِ ارضی کو روند ڈالا انہی جہنم کے وارثوں نے
فضا پہ یلغار کو جنہیں تو نے فتنۂ بال و پَر دیا ہے

یہ تیرگی زاد نسل اندھیرے کیسے بھٹک رہی تھی
چراغ کی طرح جل کے ہم نے اسے شعورِ سحر دیا ہے

کسی کے ہاتھوں کا ہے کرشمہ حسیں خد و خال کی تمازت
تمہاری تصویر میں کسی کے لہُو نے یہ رنگ بھر دیا ہے

حدی کے نغمے کی لے اُٹھی ہے، نہ کوئی بانگِ دراسنی ہے
جو یک بیک چل پڑے ہیں رہرو، یہ کس نے اذنِ سفر دیا ہے

ہے وقت کے سلسلہ کی صوُرت دراز تشویشناک لمحہ
ہُوا محیطِ حیات وُہ درد تُو نے جو مختصر دیا ہے

تو گنگنائے گا بول میں گر، کیا ہے شوقِ سخن ودیعت
نظارہ بننا پڑے گا تجھ کو ہمیں جو ذوقِ نظر دیا ہے

یہ اُن کی قبریں ہیں جو عظیم آدمی کبھی مر نہیں سکیں گے
یہ وہ ہیں راہ وطن میں بے خوف جن شہیدوں نے سَر دیا ہے

ہیں وُہ مسافر کہ ہم نے شوکت پڑاؤ ڈالا نہ منزلوں پر
کرم ہے رہبر کا ساتھ اس نے گھروں سے تا رہگذر دیا ہے

اِنقلاب آیا تو اِنساں دیو پیکر ہو گئے
ہم سمجھتے تھے کہ سارے معرکے سر ہو گئے

آئینہ ٹوٹا کہ ہم بکھرے فضا میں چار سو
لگ گئی ہے آنکھ یا ناپید منظر ہو گئے

ہم نے ہی کھولے تھے کل زنداں کی دیواروں میں یہ
صورتِ دیوار ہم پر بند جو در ہو گئے

معجزہ یزداں کا ہے یہ اَور نہ سحرِ اہرمن
آدمی ہم وقت کے سانچے میں ڈھل کر ہو گئے

خوں رواں ہے جم گئی ہے پھر بھی شریانوں میں جاں
دل دھڑکتے ہیں مگر یہ جسم پتّھر ہو گئے

تھی ہمارے دم سے ہر تخئیل کی آبادیاں
جیتے جی ہم مر گئے یا ذہن بنجر ہو گئے

لائے ہیں ایمان اپنی ذات پر ہم اے خُدا
دیکھ تو کس شان سے مومن یہ کافر ہو گئے

تم سلامت ہو تو یہ مرتے رہیں گے عمر بھر
جو تمہارے ہاتھ سے اِک بار جاں بر ہو گئے

دُشمنِ جاں بھی ہے شوکتؔ کیا طبیعت آشنا
دُشت کش ہے اَب ستم سے ہم جو خوگر ہو گئے

دُنیا سے امتیاز اُٹھا خوُب و زشت کا
دوزخ میں جل رہا ہے جزیرہ بہشت کا

ماحول نے تراش لیے ہیں مجسمے
پرتو کس آدمی میں ہے اپنی سرِشت کا

لوگ آئے آئینوں کی تواضع کے واسطے
نذرانہ جھولیوں میں لیے سنگ و خشت کا

کر کے ستم ظریف مرتب حیات کو
الزام دے رہا ہے مری خود نوشت کا

ہم بن گئے ہیں آج وُہ مہرہ بساط پر
اپنی ہی چال سے جسے دھڑکا ہے کشت کا

جو لوگ اپنی ذات میں ہیں ایک معجزہ
موضوع بن گئے وُہ حرم و کنشت کا

شوکتؔ نسیم یثرب و بطحا ہے جانفزا
نشہ ہے دلکشا مئے جیلان و چشت کا

جسم کو جاں کا سراپردۂ رعنائی کر
سائے کو دُھوپ کی مانند نہ ہرجائی کر

فکر کو ذہن کی دیوار پہ تصویر بنا
آنکھ کو مدح سرا، دل کو تماشائی کر

ہیں تری ذات میں بھی بوقلموں ہنگامے
تو مگر خود کو ذرا خوگرِ تنہائی کر

شہر در شہر ترا نام نکلتا جائے
اے ستمگر مری جی کھول کے رُسوائی کر

عین ممکن ہے کہ ہو جائے یہی سجدہ قبول
اپنی دہلیز پہ تو ناصیہ فرسائی کر

مرنے والوں کو جلانے کا تکلف کیا ہے
جیتے جی مر گئے جو اُن کی مسیحائی کر

شوکتؔ اب آنسوؤں میں بھیگ رہی ہے آواز
درد بہنے لگا ہے زمزمہ آرائی کر

○

رُونما ہوتے ہیں کیا معجزے فنکاروں سے
دل سلگ اُٹھتے ہیں جب بجھتے ہُوئے پیاروں سے

دادِ فن اپنے تراشیدہ بُتوں سے مانگو
زندگی اخذ کرو کھیل کے کرداروں سے

اَب کہ در آیا ہے تو رُوح کی اِنگنائی میں
زندگی یوں نہ کھرچ جسم کی دیواروں سے

زخم تھے، پھُول سے یہ میں نے سجائے دل پر
تو نہ اے جانِ چمن کھیل اِن انگاروں سے

آگ سے آگ بُجھائی نہیں جاتی پیارے
پونچھ لے بہتے ہُوئے اشک یہ رخساروں سے

ذہن کے خول میں رہتا ہے درندوں کی طرح
آدمی کب نکل آیا ہے ابھی غاروں سے

زندگی ہے کہ اُٹھائے لیے پھرتا ہُوں صلیب
ذات کو چیرتا رہتا ہے کوئی آروں سے

امن کی فاختہ کے منہ میں ہے زیتون کی شاخ
یہ الگ بات بدن لیس ہے ہتھیاروں سے

ہے بلیغ اُس لبِ مجبُور پہ ٹھٹھری ہُوئی بات
شوکتؔ اِن زمزمہ و شعر کی جھنکاروں سے

○

سرِ منزل بھی تو گم قافلہ ہو سکتا ہے
آج اَور کل میں بڑا فاصلہ ہو سکتا ہے

میرے نزدیک تو قائم ہے یہ میرے دم تک
وقت کا ہو ابدی سِلسلہ ہو سکتا ہے

بے حمیّت نہیں ہو سکتا ہے اِنساں گرچہ
بعض حالات میں بے حوصلہ ہو سکتا ہے

وقت بیدار ہُوا عدل کی میزان لیے
اَب کسی لمحہ کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے

تم مرے پاس ہو لیکن شجرِ ممنُوعہ
نہیں تقدیر سے بھی کچھ گلہ ہو سکتا ہے

اہلِ مقدور کو چاہے ملے اِنعام مگر
اہلِ ہمت کا بھی شوکتؔ صلہ ہو سکتا ہے

○

عافیت ظُلم سے اَور پیار قضا سے مانگا
ہم نے اِنصاف بھی اربابِ جفا سے مانگا

کر دیا خُلد کے ہر کھیت سے بیدخل ہمیں
حصّہ جب دانۂ گندم میں خُدا سے مانگا

جب جھٹک کر اُٹھے ہم نیند سے بوجھل سپنے
تازگی صبح سے لی، سانس صبا سے مانگا

نوُر جب چاہا کیا اپنے ہی ماتھے سے طلوُع
سایا مانگا تو تری زُلفِ دوتا سے مانگا

وُہ بھٹکتا رہا منزل کے قریب آوارہ
جس نے منزل کا پتہ راہ نما سے مانگا

حق و ناحق کی لڑائی کی سوانح ہے گواہ
بھیک میں رحم اِسی منعم نے گدا سے مانگا

وُہ مرا نطق ہی دیدے تو غنیمت شوکتؔ
لحنِ داوٗد نہیں نغمہ سرا سے مانگا

○

بُتوں سے مانگو نہ آدمی دیوتا سے مانگو
ملے گا، جو مانگنا ہے تم کو خُدا سے مانگو

تمہیں اگر منزلوں کی کچھ واقعی لگن ہے
نہ راستے کا پتہ کسی رہنما سے مانگو

تمہاری اِن اُنگلیوں کے جو پھُول سرخرو ہیں
جواز اِن کا لہُو سے لو، مت حنا سے مانگو

نہیں قبُول اِک ذرا گراں نرخ پر تمہیں ہم
ہمیشہ اپنے لیے زیادہ بہا سے مانگو

عبث سہی خوش جبیں سے چاہے سوال کر لو
اُمید بھی ہو، نہ قرض تم کج ادا سے مانگو

یہ لازمی ہے کہ تم ذرا سعی سے بھی ڈھُونڈو
ملے گا پھر اُس کے بعد سب کچھ دُعا سے، مانگو

اگر ہے بازو میں زور، مل جائے گا یقیناً
نہیں ملے گا کبھی جو حق التجا سے مانگو

ہے اہلِ زر کی تونگری مفلسوں کا صدقہ
گدا بنو بھی اگر، نہ شوکت گدا سے مانگو

جھانک کر ذات کے اندر یہ تماشا دیکھو
شہر صحرا میں، کبھی شہر میں صحرا دیکھو

بہتے دریا میں نظر آئے ہر اک بوند الگ
یہ نہیں معجزہ گر بوند میں دریا دیکھو

صوفیو معرفتِ اہلِ صفا تو یہ ہے
کبھی انسان میں انساں کا سراپا دیکھو

اہلِ حکمت نہیں دل سوز ہیں سارے یکساں
سنگ کو سنگ کہو، شیشے کو شیشہ دیکھو

قرمزی رنگ لہُو سے ہے پسینہ میرا
اَور اربابِ ہوس رنگ تمنا دیکھو

عمر بھر تم پہ رہے اہلِ تماشا کا ہجوم
عمر بھر تم یہ تماشا کھڑے تنہا دیکھو

خواب سازوں کی ہے ایجادِ حسیں یہ اُمّید
سدا اُس آئینہ میں تم رُخِ زیبا دیکھو

گروہ نابینا ہو کچھ حرج نہیں ہے شوکتؔ
رہنما ہو نہ مگر عقل کا اندھا دیکھو

○

درد میں جیسے کوئی عمر بڑھا دیتا ہے
وقت کی چال کو اک روگ لگا دیتا ہے

یہ وُہ صہبا ہے جو کی جسم کی بھٹّی سے کشید
خُوں پیو خُوں یہ بڑا تیز نشہ دیتا ہے

حبس جو آج ہے ماحول میں افزوں افزوں
یہ بڑی تند ہواؤں کا پتہ دیتا ہے

کھیت کی کرتا ہے جو رات کو خود رکھوالی
دن دہاڑے وہی کھلیان جلا دیتا ہے

اس نے انجیل پڑھی اور نہ عبرت سیکھی
وُہ جو دُشنام کے بدلے میں دُعا دیتا ہے

غم بھی گر بھیک میں چاہو تو نہیں مل سکتا
در بدر کیوں بھلا درویش صدا دیتا ہے

بالعموم آندھیاں بھی جن کو تھپک دیتی ہے
نرم جھونکا انہیں یک لخت جگا دیتا ہے

ہم ہیں وُہ دیپ اندھیروں سے نمٹنے والے
خود جلاتا ہے اگر کوئی بجھا دیتا ہے

درز پڑتی ہے مرے سانس سے سناٹوں میں
غلغلہ ہلکا سا اِک بول مچا دیتا ہے

آگیا ہے مجھے دھیان اپنا ترے دھیان کیساتھ
دیکھنا یہ ہے کسے کون بھلا دیتا ہے

پہلے پڑھ لیتا ہے وُہ دل میں اتر کر مجھ کو
پھر وُہ اپنی ہمیں رو داد سُنا دیتا ہے

درد کو زندگی کے آگیا آرام سا کچھ
جیسے کوئی ترے دامن سے ہوا دیتا ہے

بڑھ کے ہم ایسے مسیحا کی بلائیں لے لیں
درد دیتا ہے تو ساتھ اُس کی دوا دیتا ہے

تجربہ نصف صدی کا ہے یہ اپنا شوکت
آدمی سے جو نہ مانگو تو خُدا دیتا ہے

○

خودشناسی ہو تو ہر معجزہ امکان میں ہے
ایک چھوٹی سی خدائی ہر اک انسان میں ہے

آزمائش میں خدا کو نہ دعا مانگ کے ڈال
دیکھ لے پختگی کتنی ترے ایمان میں ہے

اس سے بھیانک نہیں دوزخ کا تصوّر ممکن
ہر گھڑی ذہن نئے خوف سے خلجان میں ہے

ہے مری جاں میں ترے جسم کی کیفیّتِ لمس
گو مرے پاس ہے تو اور نہ مرے دھیان میں ہے

داستاں گو کو ترے ذکر سے فرصت بھی ملے
نام میرا بھی اِس افسانے کے عنوان میں ہے

کارسازانِ معیشت کا یہ فیضان ہے خوب
کل جو نقصان میں تھا آج بھی نقصان میں ہے

زندگی گذری ہے اِس طور سے شوکتؔ جیسے
کبھی ساحل پہ ہے کشتی، کبھی طوفان میں ہے

○

ٹھنی جو ابلیس سے ہمیں داؤ پر لگایا
یہ زندگی ہم نے تجھ سے مانگی نہ تھی خدایا
ہمیشہ نزدیک تر سمجھتے رہے کسی کو
ہمیشہ دل سے دماغ تک فاصلہ بڑھایا
شکستہ آئینہ میں سراپا کو ڈھونڈتا ہوں
میں تیرگی میں ٹٹولتا ہوں بدن کا سایا
نہیں ہے واضح کہ ہم میں باہم ہے رابطہ کیا
مگر یقیں ہے نہ ہم پرائے نہ تُو پرایا
سراب گاہِ اُمید میں تشنگی بجھانے
وُہ سادہ لوحوں کا بے عمل اژدہام آیا
یہ وقت کے سنگدل مورّخ کا فیصلہ ہے
قوی نے کمزور آدمی کو ضرور کھایا
اگر پسینہ کے بیج بوئے تو کال کاٹا
بجھی نظر تو لہو کا شوکت دیا جلایا

تمہارے بھرپور جسم کا یوں طواف کرتی رہیں نگاہیں
کہ جیسے گنجان جنگلوں میں سے ہو کے گذریں اجاڑ راہیں
اُمید کا بے وجود منظر، بہشت موعود کا تصوّر
حیات مشکل تھی آدمی نے تراش لی ہیں فرارگاہیں
ضمیر پیمانۂ عمل کیوں، خُدائی تدبیر میں مخل کیوں
عظیم انساں کسی کے منشا سے مرنا چاہیں نہ جینا چاہیں
کہاں خنک چھاؤں، وقت سے پہلے تری زُلفوں میں دھوپ چمکی
کہاں سبک گود، عمر سے پیشتر مری تھک چکی ہیں باہیں
وطن کی مٹی سے پھر لہو کی شدید مہکار آ رہی ہے
پھر ایک دلدوز مرثیے کی طرح گھلی ہیں نفس میں آہیں
جہاں کی نشو و نما تو آب و ہوا کی نسبت سے ہے گوارا
مگر یہ منطق غلط کہ انساں ہر ایک ماحول سے نباہیں
ہم اِس طرح اپنی ذات کے خول میں دبکتے ہیں ڈر کے شوکتؔ
کہ جیسے بھونچال میں کوئی ڈھونڈتا ہو پاتال میں پناہیں

○

بُت خُدا، کعبہ صنم خانہ بنا سکتی ہے
کیا سے کیا جرأت رندانہ بنا سکتی ہے
جسم کے خول میں حیواں کو چھپا کر تہذیب
شہر کے وسط میں ویرانہ بنا سکتی ہے
واقعہ شرط نہیں ہے، کہ زبانِ مخلُوق
بات بے بات بھی افسانہ بنا سکتی ہے
سعی سے بن نہیں سکتی ہے ازل کی بگڑی
یہ تری شانِ کریمانہ بنا سکتی ہے
ذہن کی سوچ پہ مبنی ہے بہشت و دوزخ
عقل یہ بستیاں روزانہ بنا سکتی ہے
خسروی اپنی جگہ خوُب ہے لیکن دل کو
مطمئن طبعِ فقیرانہ بنا سکتی ہے
کس کو معلوم تھا شوکتؔ کہ اَب اِس عمر میں بھی
ایک لڑکی ہمیں دیوانہ بنا سکتی ہے

سارے سفر کے مرحلے آسان ہو گئے
کچھ حادثے قیام کے دوران ہو گئے

خود اپنی شخصیت پہ چڑھا کر دبیز خول
ہم لوگ اپنے واسطے انجان ہو گئے

وہ نعمتِ حیات تجھے جس پہ فخر ہے
ہم نے قبول کی تو پشیمان ہو گئے

چہروں کے خال و خد میں ہے شادابیوں کا قحط
تھے کیا حسین شہر جو ویران ہو گئے

اَب سانس کی یہ رَو بھی سماعت پہ بار ہے
یہ پُرسکُون دھارے بھی طوفان ہو گئے

جنگل اُگ آئے آدمیوں کے گھنے گھنے
بس کر دیار اَور بھی سُنسان ہو گئے

ان کا دوام دل کے جریدوں پہ ثبت ہے
اِنسانیت کی رہ میں جو قُربان ہو گئے

کوئی فرشتہ بن کے مقرّب خُدا کے ہیں
شوکتؔ ہمیں یہ ناز کہ اِنسان ہو گئے

دل کے مندر میں تیری مورت ہے
اَب خُداؤں کی کیا ضرورت ہے
گر ذرا سا سکوں میسّر ہو
زندگی کتنی خوبصُورت ہے
نہ کسی سے کوئی توقع ہے
نہ کسی سے کوئی کدورت ہے
آج دُنیا نے ہم کو چھوڑ دیا
آج تیری بڑی ضرورت ہے
دیکھنے میں ھزار چہرے ہیں
اَور کہنے کو ایک صُورت ہے
شوکتؔ اَب شعر کی ہُوئی تکمیل
میرے دیوان کی مہُورت ہے

○

مرے لہُو کی سرِ رہگذر سبیل بھی ہے
مری صلیب زدہ لاش سنگِ میل بھی ہے

بدن میں بیٹھے ہیں ہم جان کو سمیٹے ہوئے
غمِ حیات سے پامال یہ فصیل بھی ہے

جو کی بیاں تو سماعت پہ بار گذرے گی
کہ تلخ بھی ہے مری داستاں طویل بھی ہے

فضا کا زہر بتدریج ہے ثبوت نما
کہ تندرست بھی ہے آدمی علیل بھی ہے

کسی کا ثمرۂ محنت ہو اہلِ زر کو نصیب
تمہارے دعویٰ پہ آخر کوئی دلیل بھی ہے

ہر ایک شے کا ہے مصرف پہ انحصار یہاں
دراز بھی ہے یہی زندگی قلیل بھی ہے

زمانہ جیسے نمائش ہے چشم و ابرو کی
تماشہ بین بھی ہے دل یہاں قتیل بھی ہے

یہ اہلِ زُلف کریں نذر تیرگی شوکتؔ
ہمارے واسطے اِک چہرۂ جمیل بھی ہے

○

بُرا بھی ہے یہی اِنسان دلپذیر بھی ہے
کہ بے ضمیر بھی ہے صاحب ضمیر بھی ہے
ہزار راہبر و ہمسفر مزاحم ہوں
پر اپنی دھن کا بڑا پکا راہگیر بھی ہے
خوشی ہے کیوں اِسے زنجیر سے رہا ہو کر
تمہاری زُلف کا گر مُدعی اسیر بھی ہے
ہمارے دل میں ترازو کرو وثوق کے ساتھ
مگر یہ دیکھ لو ترکش میں اَور تیر بھی ہے
ہمیں تو شوق ہوا ہے کہ اَب بنیں رانجھا
مگر سیال میں وارث کی کوئی ہیر بھی ہے
ہمیں سے اُن کو مقدر ہوئی ہے سرداری
ہمارے واسطے اَب حکم دار و گیر بھی ہے
ہمیں تو ہر کہیں محتاج ہی ملا اِنسان
غریب بھی یہی شوکت یہی امیر بھی ہے

○

خُدا عظیم ہے، لیکن نہیں ہمارے لیے
مِلا نہ ایک بھی، اُس کے بڑے سہارے لیے
ہم انقلاب کی پیشین گوئی کرتے ہیں
سحر طلُوع ہُوئی ہے شفق کے دھارے لیے
نہ اپنے واسطے کرنیں ہیں دن کی جھولی میں
نہ رات ہی کبھی آتی ہے چاند تارے لیے
نہ اَب جلے گا ہمارا لہُو چراغوں میں
یہ زندگی کے شبستان میں تمہارے لیے
ہمیں تو مانجھی نے منجدھار ہی میں چھوڑ دیا
چلا ہے ناؤ کو اپنی مگر کنارے لیے
ہے باغبان تو کاغذ کے پھُول ہاتھوں میں
ہے مہرباں تو فقط آنکھ میں اشارے لیے
ہمارے واسطے قوس قزح بنائیں گے
رفیق آئے کئی رنگ کے غبارے لیے
ہمیں طوافِ کلیسا کے بعد اَب شوکتؔ
چلا ہے دل کسی اِنسان کے دوارے لیے

○

ہم نے مانا ہے تجھے تو بھی خُدا بن کر دکھا
اِن خداوندانِ عالم سے بڑا بن کر دکھا

کر رہے ہیں جو بتدریج آدمی زادوں کو قتل
ایسے فرعونوں کو دریائے فنا بن کر دکھا

جو بزعم خود حصارِ ظلم میں محفوظ ہیں
اِن بلاؤں کے لیے تیغ بلا بن کر دکھا

سر تو سر، ہو رُوح کا سجدہ روا جس کی طرف
اَب یہاں وُہ قبلۂ اِنساں نما بن کر دکھا

تو بھی دہلیزِ چمن پر ہے ذرا سا مُسکرا
ہاں کبھی تو ثمرۂ آب و ہوا بن کر دکھا

مُدعی کو جس جہنّم اَور جنّت پر ہے ناز
اَب اُسی کو بے نیازِ مُدعا بن کر دکھا

الف لیلیٰ کا سمجھتے ہیں تجھے کردار لوگ
تو نے شوکتؔ آج تک جو بھی کہا، بن کر دکھا

جو دل کو دُعا دیتے ہیں غم میں سنبھلنے کی
وُہ آگ سے فرمائش کرتے ہیں نہ جلنے کی

تم ہونٹوں کی ندی پر کیا بند لگاتے ہو
چشموں کو ہے پتھّر سے ضد پھُوٹ نکلنے کی

پروانے کی صوُرت بھی جل جانا شہادت ہے
ہے شمع کی صوُرت بھی اک رسم پگھلنے کی

اَب کے تو قیامت یہ خود تو نے اُٹھائی ہے
اَب کے یہ ترے سر سے آساں نہیں ٹلنے کی

کھاد آتش و آہن کی دو مزرعۂ گیتی کو
اَور زیست سے اُمیّدیں بھی پھُولنے پھلنے کی

ہم آبلہ پا شوکتؔ، پُر خار ہر اِک رستہ
اَب تاب ٹھہرنے کی باقی ہے نہ چلنے کی

گاہ آتے ہیں حسیں خواب گھہے جاتے ہیں
ہم اِسی دھوکے میں ہر ظُلم سہے جاتے ہیں
آپ طوفاں کی طرح اُمڈے چلے آتے ہیں
اَور تنکوں کی طرح لوگ بہے جاتے ہیں
تم بھی تعزیر کی تلوار لئے بیٹھے ہو
ہم بھی بے خوف جو کہنا ہے کہے جاتے ہیں
تھے ہمیں دشت نوردی میں تمہارے ہمراہ
جانے والو ہمیں رستے میں رہے جاتے ہیں
ہم نے آسُودہ محل دیکھے تھے مستقبل میں
اَب تو اپنے یہ گھروندے بھی ڈھے جاتے ہیں
صاحب طور کو اُتریں گے لیے ساتھ کہ ہم
خوش دلے، خوش طلبے، خوش نگہے جاتے ہیں
مرحبا کہتے تھے، خوش تھی ہمیں آمد جن کی
مطمئن کتنا ہوں شوکتؔ وُہ رہے جاتے ہیں

صلیب ہی کرے جلاد، کچھ کرے تو سہی
کہ جاں بدن میں معلّق ہے، یہ مرے تو سہی
ہوا ہے کند خدایا یہ حشر کا ہتھیار
نکل کے سامنے آ، آدمی ڈرے تو سہی
نہ ہو اگر نہیں تکلیف میں افاقہ کچھ
لہو ہوا ہے کھرنڈ، گھاؤ کچھ بھرے تو سہی
ہمارے بعد ارادے کی آبرو رکھ لی
کہ نعش اُبھری تو، ہم ڈوب تر ے تو سہی
یہ اَور بات نہ معلوم ہو حقیقتِ حال
تمہاری بزم میں بے لاگ تبصرے تو سہی
تمام عمر نہ کوئی ملے، مگر یارو
کسی کے انجمنِ دل میں تذکرے تو سہی
یہاں تو کھوٹ کی منڈی میں ساجھا ہے شوکت
یہ دھندا کر لو گے، تم آدمی کھرے تو سہی

مزہ ملاپ میں کیا دل بہم جو صاف نہیں
ہے اختلاف جو کہتے ہو اختلاف نہیں

ہے نورِ تیز تو فانوس کی ضرورت ہے
کہ تیرگی کو تو محتاجیٔ غلاف نہیں

تمام تر ہے یہ جُرم و گناہ کی تصنیف
کتابِ زیست میں اِک حرفِ اعتراف نہیں

کیا زمانے نے اَب خلوتوں کو آئینہ
کنارِ عافیت و کنجِ اعتکاف نہیں

حدیث امن بظاہر ہے خوشگوار بہت
حقیقتاً یہ بجز نعرۂ مصاف نہیں

وُہ ہیں کہ لغزشِ پا اُن کی لائقِ تقلید
یہ ہم کہ راست روی میں بھی ہم معاف نہیں

ہر اک بہشت کی شوکت ہمیں بشارت دے
تمیز کا شمر و خلد و کوہ قاف نہیں

کرکے لہُو کے زائچے تیار فال دیں
پیشانیوں میں ھم نئی تقدیر ڈھال دیں
انصاف کی دہائی ہے اِنصاف کیجئے
دل میں کھٹک رہا ہے جو کانٹا نکال دیں
پھندا ہے گر، تو اہلِ جفا کیوں ملول ہوں
کیا گردنوں کا قحط ہے، جس میں بھی ڈال دیں
کرنے ہیں پھر شکارِ معیشت کے جانور
زردار سونے چاندی کے تاروں کے جال دیں
اپنے لہُو کے تُند بھنور میں بھی ڈوب کر ترے
ہم آپ کو ضرور کنارے اُچھال دیں
تم لوگ اگر ذرا سا پسینہ خراج دو
ہم جاں نثار سارا لہُو یرغمال دیں
دُشمن ہی نے بساط پہ مہرے بڑھائے ہیں
شوکتؔ بہت ہُوئی ہے بس اَب آپ چال دیں

آئے ہیں کچھ حسیں کہ نویدِ وصال دیں
ہم وُہ ستم ظریف انہیں ہنس کے ٹال دیں
اے کاش وُہ سمجھ بھی سکے نفسیاتِ عشق
ہم جس حسین شخص کو دادِ جمال دیں
اِنسانیت کا ایک ہی معیار ہے کہ لوگ
اِنسان دوستی میں ہماری مثال دیں
مشّاق ناخنوں سے تمہارے نہ کھل سکے
ہم اپنی بات سے جو گرہ دل میں ڈال دیں
تحسینِ وصف ہر کس و ناکس کا حق سہی
لیکن سند کمال کی اہلِ کمال دیں
شوکتؔ جو متفق ہوئے رائے زنی کے بعد
اَب زخمِ اختلاف وہی ہم خیال دیں

○

جینے کی ہے اُمنگ تو مرنے کا سیکھ ڈھنگ
یعنی کہ امن میں بھی ہے اِنساں میانِ جنگ
جس کا نہیں سلوک کشادہ دلی کے ساتھ
یہ عرصۂ حیات ہے اس آدمی پہ تنگ
تاریخ فکرمند نہیں ہے زوال پر
صدیوں مگر رہی ہے یہی ارتقا، پہ دنگ
جس نے نہیں کیا کبھی اپنا محاسبہ
اس کو مٹا دیا ہے زمانے نے بے درنگ
ناقوس کی صدا ہے نہ منزل کا دھندلکا
جیسے کہ پاؤں لنگ ہے اَور ہاتھ زیرِ سنگ
باعزم آدمی کے لیے یاس کفر ہے
آہن کو زیب دیتا نہیں ہے غلافِ زنگ
سینوں میں سلب ہو نہ حرارت اُمید کی
شوکتؔ اگر دلوں کو دھڑکنے کی ہے اُمنگ

بعض اوقات تو بن جاتی ہے اک لفظ سے بات
کچھ بھی معنی نہیں دفتر کے مگر بعض اوقات
زندگی میں تو بہر گام محاذ نو ہے
یہ وہ شطرنج نہیں جس میں ہو اک چال سے مات
کوئی خدشہ نہیں شاہین کو ٹڈی دل سے
ایک انسان نے ڈھائے ہیں کئی لات و منات
مستند تیرا کسی اور کا مونس ہونا
تیرے بحران میں ساتھی ہے مگر تیری ذات
آدمی کا یہی درجہ ہے کہ انساں بن جائے
یہ جو بن جائے تو سب ہیچ ہیں عالی درجات
جام و جاں عشق کے سنداں پہ ڈھلا کرتے ہیں
شاخ آہو پہ ہوا کرتی ہے عاشق کی برات
جو بھی رکھتا ہے کسی زخم پہ پھاہا شوکتؔ
منقبت اُس کے لیے اُس پہ درود اور صلوٰۃ

دوست کو محرم بنا کر دُشمنِ جاں کر دیا
تو نے اے دل آپ بربادی کا ساماں کر دیا

لغزشِ آدم تو ہم تک آئی ہے میراث میں
تھے فرشتے لیکن اس خوبی نے انساں کر دیا

مہرباں نے غم غلط کرنے کی رکھی ہے سبیل
جب پڑا ہے قحطِ مے تو زہر ارزاں کر دیا

بو مشامِ جاں زیادہ پھول کے فانوس میں
تیرگی نے روشنی کو اور عریاں کر دیا

کیسے کیسے عزم ہو کر رہ گئے منزل کی نذر
کیسی کیسی خواہشوں کو تم نے ارماں کر دیا

کب خرد میں ضعف آیا ہے کبھی، لیکن اسے
وسوسوں نے کند، اندیشوں نے حیراں کر دیا

ہم نے بھی محسوس کی ٹھنڈک ذرا سی چھاؤں میں
آج شوکتؔ کس نے زُلفوں کو پریشاں کر دیا

آئینہ تھا، پردۂ سیمیں پہ ہم آئے گئے
آدمی کے بیسیوں کردار دکھلائے گئے

تھی نہ کشتی میں کوئی خامی نہ دھارے تیز تھے
زعم تیرا کی کا تھا، ڈوبے ہوئے پائے گئے

ہم نے ہی کاٹی تھیں تیرے دست و پا کی بندشیں
پابجولاں حکم سے تیرے ہمیں لائے گئے

دھوپ کالی ہے کہ آنکھوں کی بصارت چھن گئی
سب بدن ہی مٹ گئے ہیں یا فقط سائے گئے

والہانہ جو ملے اُس سے ذرا کھنچ جائیے
مخلصانہ ہم کو دے کر دوست یہ رائے گئے

جس قدر کوشش سے ہم کرتے رہے اُن سے گریز
وُہ اسی شدّت سے قلب و ذہن پر چھائے گئے

کیا بتائیں ہم ہیں کتنے تجربوں کی یادگار
کیا کرم ہم پر ہوئے کیسے ستم ڈھائے گئے

شوکتؔ اب سستا رہے ہیں سیج پر تنہا حسین
ہم سے کیا اس ضمن میں وعدے نہ فرمائے گئے

○

زندگی کا درد ہے کتنا شدید
اک حسین اور بیسیوں درپے یزید
زندگی کی بندشیں لاتقنطو
زندگی کی خواہشیں ھل من مزید
صورِ اسرافیل اب تو پھونکیئے
اب تو جی اُٹھنے کی مل جائے نوید
کوئی ناٹک پھر سے کھیلا جائے گا
مخلصانہ پھر چلی گفت و شنید
در چمن اکنوں گل دیگر شگفت
محتسب ہم مشرب زنداں پدید
خون سے شوکتؔ جلائے ہیں دیئے
ہے یہ آزادی کی تقریب سعید

○

رہرووٗں کے ہیں جا بجا مدفن
راہ بر کر لیا تھا اک رہزن
وُہ ستم کیش اَور ہم خوش فہم
ہم بہی خواہ اَور وُہ بدظن
مُدّتوں ہم خُدا سے غیر رہے
ہو گئی تھی بتوں سے کچھ ان بن
اَب غریب الدیار لوگ سہی
ہم سے آباد تھا دیارِ وطن
بے تکلف تھا سامنے کوئی
ڈال دی ہم نے ذات کی چلمن
لہلہاتی تھی میرے کھیت میں فصل
تیری کوٹھی میں اَب جو ہے خرمن
شوکت اُس شخص نے ڈسا ہم کو
جس پہ وارا تھا ہم نے تن من دھن

○

لغزش آدم و حوا مری فطرت تری خو
میں فرشتہ ہوں مری جاں نہ کوئی حور ہے تو
میکشو مے پیئیں گے کاسۂ سر میں اس کے
محتسب توڑ کے دیکھے تو سہی جام و سبو
دل کے دلدل میں کوئی آس کنول کھل جائے
ہو نمودار کرن چیر کے شب کا پہلو
چاند کی طرح نظر آئیں یہی داغ زدہ
اوڑھ کے رخ پہ ضمیر آئیں اگر آئینہ رو
رات میں ڈوب گئی ہے جو شفق پھوٹی تھی
رائیگاں پی گئی تاریخ شہیدوں کا لہو
کٹ گیا جسم تو پیوند بھی لگ جائے گا
روح گر مسکی تو بخیہ گری ممکن ، نہ رفو
گھونٹ سکتے نہیں فطرت کا گلا جبر سے تم
پھول نوچا ہے تو کانٹوں میں زیادہ ہے نمو
جو پسینہ گرے مزدور کی پیشانی سے
اس سے بپتسمہ روا ، اس سے مناسب ہے وضو
آدمی کرتا تو ہے آدمی کے گوشت کی کاشت
شوکتؔ اُگ آئی ہیں عفریت کی فصلیں ہر سو

○

یہ الگ بات ہمیشہ سے ہمیں قہر میں ہیں
ورنہ کچھ اَور گنہ گار بھی اِس شہر میں ہیں
وُہ جو مے پی کے بھی کچھ ہوش میں رہ جاتا ہے
اس کے دکھ درد کے مداوے تو کسی زہر میں ہیں
ظُلم کا ہوگا اسی دارِ مکافات میں عدل
تو بھی اسی دہر میں ہے، ہم بھی اسی دہر میں ہیں
لہلہا دیتی ہے کھیتوں کو جو کھر ساؤں میں
سیم اَور تھور کے خطرے بھی اسی نہر میں ہیں
وُہ جو ساحل کی طرف لے کے چلی تھی کشتی
کس کو معلوم تھا طوفان اسی لہر میں ہیں
کالے کوسوں کا سفر دشت میں جیسے شوکتؔ
دُور تک سائے نہیں اِس بھری دوپہر میں ہیں

مے بہت پی، زہر کا اک جام آنا چاہیئے
زندگی کے درد کو آرام آنا چاہیئے

آدمی نے آدمی کو زندگی ترکہ میں دی
آدمی کو آدمی کے کام آنا چاہیئے

جلوہ آرا لوگ بھی کچھ دیر رہیں اِنتظار
تب تماشائی کو زیرِ بام آنا چاہیئے

کرکے طے سارا سفر اب ہے مسافر کو یہ ضد
چل کے منزل کو بھی دو اک گام آنا چاہیئے

ہے یہ کس کا تذکرہ خود فیصلہ کرلیں گے لوگ
سارے کرداروں کا لیکن نام آنا چاہیئے

اپنے ٹکڑوں سے ہم اپنی ذات کا بُت جوڑ لیں
اتنا وقفہ دُشمنِ اصنام آنا چاہیئے

چیخ کے گنبد میں شوکتؔ گوش بر آواز ہوں
ہے سکُوتِ مرگ، کچھ پیغام آنا چاہیئے

○

گر یار کے ستم کا زمانہ دراز ہے
ہم کو بھی اپنے صبرِ مسلسل پہ ناز ہے
بگڑی نہ بن سکی مری یہ بھی ہے واقعہ
یہ بھی درست ہے کہ خدا کارساز ہے
بازارِ عشق میں ہوئی افراطِ غزنوی
جب مانگ بڑھ گئی ہے تو قحط ایاز ہے
اے مطرب نہ آئے گا یوں نغمگی میں رس
زخمی ہیں انگلیاں نہ شکستہ ہی ساز ہے
سجادہ چاہیئے ترے آنچل کا جانِ جاں
مدّت کے بعد قلب کا قصد نماز ہے
مسجد میں قفل ڈال کے آغازِ شب میں شیخ
یہ معترض ہے کیوں درِ میخانہ باز ہے
میرے لہو کے تیل سے روشن ہے یہ چراغ
تہذیب کے فروغ میں شوکتؔ یہ راز ہے

○

اس مہرباں نے چاند یا سُورج تو کیا دیئے
دو اک دیئے تھے شہر میں وُہ بھی بُجھا دیئے
منڈی میں اَب لگے گی نمائش بہار کی
گُلچین اہلِ باغ نے مالی بنا دیئے
تھا قید و بند پہلے بدن کا معاملہ
یاروں نے ذہن و دل پہ بھی پہرے بٹھا دیئے
ہم جس کی عافیت کی دُعا مانگتے رہے
ہم کو اسی حبیب نے صدمے سوا دیئے
شاید وہیں پہ ہوتی ہیں حاجت روائیاں
گذرے جس آستان سے ہم بے صدا دیئے
چاہی تھی داد اُس نے ستم کی وثوق سے
شوکت بڑے خلوص سے ہم مسکرا دیئے

اَب مجھے اپنے کیے پر کچھ پشیمانی نہیں
بے سبب خود پر روا یہ زہر خورانی نہیں

یہ بدن ہیں یا اُگے ہیں پتھروں میں خال و خد
اس پہ یہ حیرت کہ جیتے ہیں گراں جانی نہیں

مان لیتے ہیں کہ چربہ ہے کہیں کا یہ جہاں
لیکن انساں یہ کسی کا مظہر ثانی نہیں

بے نیازانہ گذرتے ہیں حسینوں کے ہجوم
میں سمندر میں ہوں پینے کو مگر پانی نہیں

شوق سے کرتے رہو ماخوذ ناکردہ گناہ
منصفوں کے سامنے پیشی ہے نگرانی نہیں

آدمی نے قحط برپا کر دیا بن کر خدا
ورنہ اس دُنیا میں کس شے کی فراوانی نہیں

کیا گلہ نا اہل لوگوں کا کہ ان میں بیٹھ کر
ہم نے شوکتؔ آپ اپنی قدر پہچانی نہیں

○

لخت لخت

جانتا ہوں کہ محبت ہے یہ الزام نہیں
میں پشیماں ہوں مگر تیری تمنّا کر کے

○

کیوں لذت اِنتظار کی جائے تمہارے ساتھ
دِل کو رہے یہ وہم کہ تم لوٹ آؤ گے

○

شاید مرے خیال کا پیکر تراش لے
فطرت بڑے وثوق سے پیکر تراش ہے

○

تم مرے دِل میں نہ آتے تو یہ احساں ہوتا
زندگی یوں بھی گذرنا تھی، گذر ہی جاتی

○

تمہارے غم کو کئی گُل رُخوں سے بہلایا
مگر تمہاری محبّت کا درد کم نہ ہُوا

○

عمر بھر دل میں کوئی شخص رہا ہے شوکتؔ
آج تک اس سے میسّر نہ مُلاقات ہُوئی

○

جو عین عہدِ خزاں میں کِھلے کہیں تنہا
نقیبِ فصلِ بہاراں وہ پھُول ہوتا ہے

○

جھُلس رہے تھے جوانی کی آگ میں اعضا
نگارِ عمر اسی دوزخ میں پھر سے ڈال مجھے

○

کتبہٗ سیّد لاور جاوید زیدی

عطا کیا دِل مُردہ تری عنایت ہے
جو زندگی اسے ملتی تو ہم نہ جی سکتے

○

یاد آتا ہے تری ہمسفری کا عالم
ہم پشیمان ہیں کیا کیا سرِ منزل آکر

○

وہ ہم سے زنجیرِ زُلف کے مسئلوں پہ شوکتؔ اُلجھ رہے ہیں
کبھی تہِ دام جو نہ آئے، کبھی جنہوں نے قفس نہ دیکھا

○

ترا رابط ایک بے مہر آدمی سے روز افزوں ہے
میں اکثر سوچتا ہوں دل ترا انجام کیا ہوگا

○

تجھ کو اے دل ہے عنایت کی توقع ان سے
اب جنہیں یاد نہیں تجھ پہ جفا بھی کرنا

○

انجمن میں ہے ایک سنّاٹا
اور تنہائی گنگناتی ہے

○

مصنف کی دوسری مطبوعات

(1) اشک آتش (مثنوی پاکستان)

(2) شیشہ ساعت (تاریخی نظمیں)

(3) کوئے بتاں منظومات

(4) کوئے بتان رومانی کلام

(5) جل ترنگ گیت

(6) رسالت خلافت

(7) تاریخ اسلام

(8) تاریخ اسلام (محمد بن قاسم تا اورنگ زیب عالمگیر)

(9) تاریخ ہند و پاک انگلش 712 تا 1965

(10) تاریخ عالم انگلش (دس موضوع)

(11) فردوس گم گشتہ (ملٹن سے ترجمہ)